صغیر رحمانی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

داڑھی

صغیر رحمانی

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی، پٹنہ کا مالی تعاون شامل ہے۔
کتاب میں شائع مشمولات یا کسی قابل اعتراض مواد کے لئے بہار اردو اکادمی ذمہ دار نہیں ہے۔

DARHI

(Afsane)

by: Sagheer Rehmani

Year of Edition 2016
ISBN 978-93-86285-00-3
₹ 200/-

نام کتاب	:	ڈاڑھی (افسانے)
مصنف/ ناشر	:	صغیر رحمانی
پتا	:	بیگم پور، آرہ، بہار (ہندوستان) 802301
موبائل نمبر	:	09708680472,09771478369
ای میل	:	sagheerrehmani@gmail.com
صفحات	:	۱۶۰ صفحات تعداد : ۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت	:	۲۰۰ روپے
سن اشاعت	:	۲۰۱۶ء
کمپوزنگ	:	ریشما خان، جھانسی
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

شریک حیات زینت اور بٹیا عطیہ شاھی

کے نام

ایک مختصر کہانی ایک اجنبی سے اندھیرے میں کیا
گیا ایک بوسہ کی طرح ہے۔

سٹیفین کنگ

فہرست

داڑھی

داڑھی

ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اپنا پرس کھولا۔ سوسو کے دو پتے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی۔ 'رونی سے یہاں تک کے دوسوروپے...؟ سچ ایک دم گلا کاٹنے لگے ہوتم لوگ۔'

ٹیکسی ڈرائیور بھی کچھ کم ٹھس نہیں تھا، چھوٹتے ہی بولا۔ 'وقت بھی تو کافی لگتا ہے میڈم اور پھر پیٹرول بھی تو...'

'ارے مجھے معلوم ہے، پیٹرول سے ہی چلتی ہے، پانی سے نہیں...' اس کی آواز میں قدرے جھلاہٹ تھی۔ کھسک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ 'چلو بیٹے، باہر نکلو۔' اسٹینڈرڈ تھری میں پڑھ رہی اپنی بیٹی کو اس نے باہر کیا پھر خود بھی باہر آگئی۔ کچھ نیچے تک سرک آئے نظر کے چشمے کو اس نے انگلی سے اوپر کیا پھر موبائل میں وقت دیکھنے لگی۔ ابھی سوا دس بجا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر پیدا ہوا۔ شکر ہے، وقت سے اسٹیشن پہنچ گئی۔ اس کی ٹرین گیارہ پینتالیس میں تھی۔

جب کہیں جانا ہوتا ہے، ایک عجیب طرح کے، نامعلوم اندیشہ سے بھر جاتی ہے وہ۔ کئی روز پہلے سے ہی سفر کا ایک ایک سامان بیگ میں رکھتی جاتی ہے۔ یہ نہ چھوٹ جائے وہ نہ چھوٹ جائے۔ کہیں ٹریفک کے جام میں نہ پھنس جائیں، کہیں ٹرین نہ مس ہو جائے، اتنے بجے گاڑی ہے، اتنے بجے نکلنا ہوگا۔ عجیب طرح کی گھبراہٹ، اضطراب اور خدشات سے گھری رہتی اور سامان اکٹھا کرتی رہتی۔ ساتھ ہی سارا جوڑ گھٹاؤ اس کے اندر چلتا رہتا۔

لیکن وہ تو وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ تین روز قبل سے جو ایک بے چینی

غالب تھی اس پر، اچانک وہ راحت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ گہری سانس خارج کرتے ہوئے پرسکون نظروں سے اس نے چاروں جانب دیکھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کا نظارہ ہی بدلا ہوا تھا۔ چپے چپے پر پولیس لگی ہوئی تھی۔

'ارے یہ کیا بھیا، اتنی فورس کیوں ہے...؟' اس کے منہ سے یکلخت نکلا۔

'کچھ ہوا ہوگا میڈم...' ڈرائیور نے لاپرواہی سے کہا اور اتنی ہی لاپرواہی سے ڈگی سے اس کا سامان نکال کر اس کے پیروں کے پاس پٹک دیا۔

'ارے سنبھال کے بھیا۔ پاپا کے آچار کی شیشی ہے اس میں۔ نہ جانے ٹوٹی یا بچی...؟' اس نے تھیلا اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔ 'پر یہاں ہوا کیا ہے...؟ اتنی پولیس...؟ ریل منتری تشریف لا رہے ہیں کیا...؟'

'ارے ہٹا لے وہاں سے... جلدی کر۔' ذرا دور کھڑے پولیس کے جوان نے ٹیکسی ڈرائیور کو آواز لگائی تھی۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو وہ قلیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ دو دو قلی اس کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔

'ارے بھئی دو نہیں، ایک چاہیے۔ سامان ہی کتنا ہے...؟'

'ہاں میڈم چلیے...' ایک آگے بڑھ کر بولا تو دوسرا واپس مڑ گیا۔

'ریوا ایکسپریس...'

'چار نمبر میڈم...'

'چلو...'

'پچاس روپیا میڈم...'

'کیا...؟' حیرت واستعجاب سے اس کا منہ کھل گیا۔

'ایہے ریٹ ہے میڈم...'

'کیا مجھے نہیں معلوم؟ پہلی بار جا رہی ہوں؟ ہر دو ماہ پر کانپور جاتی ہوں ۔ بیٹے، جاتے ہیں نا ہم؟ مجھے الّو بنا رہے ہو؟ ایکدم سے لوٹ مچی ہے...؟'

'ایسے ریڈوے ہے میڈم۔ چلنا ہوتو...'وہ اس کا بیگ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔

'اوہ مما، چلئے نا...'اس کی بیٹی زچ ہو رہی تھی۔

'یہاں رکیے نہیں، رکیے نہیں۔ چلتے رہیے...'وہی پولیس والا پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

عجیب بے بسی تھی۔ شش و پنچ میں پڑی بیٹی کا ہاتھ تھامے کھڑی رہی کچھ دیر، پھر قلی سے مخاطب ہوئی۔

'چلو لیکن ٹرین میں برتھ تک چھوڑنا ہوگا...؟'

قلی مسکراتا ہوا تیار ہو گیا۔ عام طور پر قلی برتھ تک ہی سامان پہنچاتے ہیں، پر اسے لگا، اس کی بات رہ گئی، اب پچاس وصول ہو جائیں گے۔

'بھیا، آج اتنی پولس کیوں ہے یہاں؟ آپ کے لالو جی آ رہے ہیں کیا...؟ ارے بیٹا ٹھیک سے... نیچے دیکھ کر چلونا...'وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

'میڈم، آپ کو کچھوؤ معلوم نہیں ہے کا...؟ بمبے ٹیشن پر اتنک وادیوں نے بم بسپھوٹ کیا ہے نا۔ ابھی ایک دو گھنٹا پہلے ہی کی تو بات ہے۔ بہتے لوگ مارے گئے ہیں۔ ٹرینو کو اڑا دیا ہے۔ اسی لیے اینہا بھی سکورٹی لگی ہے۔ اندر تو بڑی چیکنگ و یکنگ چل رہی ہے۔ ای موہمڈنون چین سے جینے نہیں دے گا سب...' آخری جملہ اس نے ہونٹ دبا کر دھیرے سے ادا کیا تھا۔

چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ کپڑوں کے نیچے، جسم کے سارے رواں یکلخت کھڑے ہو گئے تھے۔ قلی اپنی رفتار میں آگے بڑھا جا رہا تھا۔ وہ ٹھٹھکی کھڑی رہی۔ سوچا، قلی کو روکے، نہیں روک سکی۔ اس نے بیٹی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی، خود کو متوازن کرنے کی کوشش کرتی دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ بڑی سخت سکیورٹی تھی۔ پولیس

کے جوان ہتھیار سنبھالے بالکل مستعد کھڑے تھے۔ پولیس کے کتے ایک ایک شئے سونگھتے پھر رہے تھے۔ جگہ جگہ بالو بھری بوریاں رکھی ہوئی تھیں، ان کے پیچھے بندوق سنبھالے کمانڈو الرٹ کھڑے تھے۔ مین گیٹ پر اتنی سخت چوکسی کہ ایک ایک آدمی مٹل ڈٹکٹر سے ہو کر گزر رہا تھا۔ پولیس والے مسافروں کے بیگ، سوٹ کیس کھلوا کھلوا کر دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک چیز کی باریکی سے جانچ پڑتال کی جارہی تھی۔

مٹل ڈٹکٹر سے ہو کر وہ اندر پہنچی تو ایک سہرن پیدا کر دینے والے سنّاٹے نے اس کا استقبال کیا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا، اسٹیشن ہے۔ نہ شور شرابہ... نہ بھاگا بھاگی... ایکدم خاموشی اور خاموشی میں لپٹے رینگتے ہوئے لوگ۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کا اعلان اور چیتاوَنی....

'...یاتریوں سے انرودھ ہے کہ کسی بھی سندگدھ ویکتی سے ساوَدھان رہیں...اس کی سوچنا ترنت پولیس یا ریلوے کرمچاری کو دیں... یاتریوں سے نویدن ہے کہ کسی بھی لاوارث وستو کو ہاتھ نہ لگائیں...کرپیا دھیان دیں، کسی بھی آپات استھتی میں خود کو فوراً سرکچھت استھان پر لے جائیں...'

اس نے محسوس کیا، اس کے سینے کی دھڑکن تیز تیز چلنے لگی ہے۔ اس نے اپنا چشمہ ٹھیک کیا اور خود کو پرسکون کرنے کی سعی کرنے لگی۔ دھیان بٹانے کی غرض سے اس نے بیٹی سے پوچھا۔

'بیٹے' نانا کا سویٹر کس والے بیگ میں رکھا ہے...؟'

'بلیک والے میں...' بیٹی نے مختصر سا جواب دے کر بات ہی ختم کر دی لیکن اسے تو کچھ بولتے رہنا تھا۔ یہ سکوت اس کے ذہن و دل پر بڑا اثر انداز ہو رہا تھا۔

'لیکن بیٹے...، نانا کو زیادہ تنگ نہ کرنا...ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...ہم لوگ ان سے مل کر دو ایک دنوں میں واپس آجائیں گے...'

اس کی بیٹی چپ رہی، چلتی رہی۔

'یہ بول کیوں نہیں رہی...؟ ڈری ہوئی تو نہیں ہے...؟'

'بیٹے، آپ نے مما کی بات کا جواب نہیں دیا...؟'

'مما، نانا کو دلی کیوں نہیں لاتے؟ میں ان کے ساتھ گھوڑا گھوڑا کھیلتی...؟'

برجستہ وہ مسکرا پڑی۔ ہونٹوں کی دھاریاں پھیل گئیں۔ 'وہ نہیں آئیں گے بیٹے، انھیں کانپور ہی اچھا لگتا ہے۔'

اس کی ٹرین پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھی۔ قلی رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

'ایس الیون بھیا۔ برتھ نمبر ۲۹۔۲۸...' اس نے قلی کو بتایا۔

ٹرین کے اندر آئی تو یہاں بھی خاموشی۔ لوگ چپّی کی چادر تانے اپنی برتھ تلاش کر اپنا سامان رکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے بیٹی کو برتھ پر بیٹھا دیا۔ پیسے لے کر قلی جا چکا تو وہ بھی اپنا سامان برتھ کے نیچے رکھنے لگی۔ تھیلا اس نے اوپر ہی رکھا کہ اس میں پانی کی بوتل اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ پوری بوگی کا ماحول وہاں چھائی ہوئی خاموشی سے بوجھل ہو رہا تھا۔ گو کہ بوگی میں بہت کم لوگ تھے، آدھی سے زیادہ برتھ خالی تھیں۔ جبکہ عام طور پر اس ٹرین میں کافی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بھی کانپور جاتی تھی، اسی ٹرین سے جاتی تھی۔ یہ دیر رات کھلتی تھی اور اہل صبح کانپور پہنچا دیتی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا، کب چلے، کب پہنچ گئے لیکن آج اتنی کم بھیڑ...؟

سامان اڈجسٹ کر کے وہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ متفکر بھی لگ رہی تھی۔ اس کی برتھ جہاں تھی، وہ پورا کمپارٹمنٹ تو بالکل ہی خالی تھا۔ ۲۹۔۲۸، لوور مڈل برتھ اس کی تھی۔ اس کے اوپر سامنے کی تینوں اور کنارے کی دونوں برتھ خالی تھیں۔ ابھی ٹرین چھوٹنے میں دیر بھی تھی۔ ہر کوئی اس کی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ دو گھنٹا پہلے ہی اسٹیشن آ جائے۔ اس نے سوچا تو ہنسی آ گئی۔

سچ، وہ تو ایکدم نمونہ ہے۔ کئی روز پہلے سے تیاری کر رہی ہے پھر بھی پاپا کا ایش ٹرے رہ ہی گیا۔ راجیو سے بول کر جے پور سے منگوایا تھا۔ لے تو آیا تھا، پر اس کا نن اسٹاپ لیکچر بھی سننا پڑا تھا۔ 'ایک طرف تو پاپا کو سگریٹ پینے سے روکتی ہو، دوسری طرف ایش ٹرے لے جا کر دے رہی ہو۔ تمہاری تو بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہونہہ، چھوڑ دی پاپا نے سگریٹ اور تم نے چھوڑ وا دی...'

'بات سمجھا کرو راجیو... بولتی ہوں اس لیے کہ ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ کیسے ہانپتے ہانپتے بے سدھ ہو جاتے ہیں؟ یہ بیماری ہوتی ہی ایسی ہے۔ پر میں یہ بھی تو جانتی ہوں، وہ چھوڑیں گے نہیں اس کو۔ ان کے ساتھ ہی جائے گی۔ اس عمر کی عادتیں کہاں جاتی ہیں...؟'

'بیٹے' آپ کچھ کھاؤ گے؟ چپس نکال لو تھیلا میں سے...' اس نے بیٹی سے کہا۔

اس کا موبائل بجا۔ راجیو تھا۔ چنئی گیا ہے آفس کے کام سے۔

'ہاں راجیو، ٹرین میں بیٹھ گئی ہوں۔ اب چلنے ہی کو ہی۔ ہاں ہاں، اسٹیشن آئی تب پتہ چلا ممبئی کے بارے میں۔ یہاں بھی بہت سخت سکیورٹی ہے۔ ارے نہیں، چلی جاؤں گی۔ اب تو بیٹھ چکی ہوں۔ ڈونٹ وری... ہاں ہاں، بیٹی ٹھیک ہے... نہیں، ڈری نہیں ہے... لو بات کر لو...' اس نے فون بیٹی کی طرف بڑھایا۔ 'بیٹے پاپا سے بات کرو...'

'ہلو پاپا... جی، چپس کھا رہی ہوں... آپ نے کھانا کھایا... جی میں ٹھیک ہوں... آپ کب لوٹیں گے پاپا؟ مما بتا رہی تھی کہ نانا سے مل کر ہم لوگ بھی دو دن میں دہلی لوٹ جائیں گے... جی پاپا... بائے پاپا...'

ٹرین کھلنے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ کنارے والی دونوں برتھ پر مسافر آ گئے تھے۔ اُپر برتھ والا تو باضابطہ لمبی تان کر لیٹ چکا تھا۔ نیچے والا نیم دراز کوئی میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

اس نے مڈل والی برتھ کھولی۔ تھیلے سے چادر نکال کر بچھایا اور بیٹی کو لٹا دیا۔ ’ بیٹے، سردی لگے تو دوسری والی چادر اوڑھ لینا...چلو، اب تم سو جاؤ...گڈ نائٹ...‘

اس نے اپنی برتھ پر بھی چادر بچھالی۔ موبائل میں چھ بجے کا الارم لگایا اور کھسک کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ نومبر کی ہلکی نم ہوا نے اس کے جسم کو چھوا تو اس کے اندر کنکنی گدگدی بھر گئی اور قدرے تازگی محسوس کرنے لگی وہ۔ باہر پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پولیس کے مسلح جوان بھی گشت لگا رہے تھے۔

’نہ جانے ممبئی کی کیا خبر ہے...؟‘ اس نے سوچا، پاپا کو فون کر دینا چاہیے۔ فکر مند ہوں گے وہ۔‘ اس نے پاپا کو فون ملایا۔ ’جی پاپا... میں بول رہی ہوں... جی، ٹرین میں ہوں...ٹھیک ہوں... ہاں ہاں...وہ بھی ٹھیک ہے...سو رہی ہے...آپ فکر نہ کریں...میں صبح پہنچ جاؤں گی...‘

گاڑی رینگنے لگی تھی۔

’...گاڑی کھل چکی ہے پاپا...میں صبح پہنچ رہی ہوں...‘

فون بند کر اس نے سامنے دیکھا۔ سامنے نیچے والی برتھ کا مسافر بھی آ چکا تھا۔ شاید رینگتی ہوئی ٹرین لپک کر اس نے پکڑی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے، ہاتھ میں کچھ وقت لے کر نہیں چلنے سے۔ ایسی ہی بھاگا بھاگی مچتی ہے۔ نا بابا نا... اپنا فنڈا ٹھیک ہے۔ کم سے کم گھنٹا، آدھ گھنٹا پہلے پہنچو۔ بھلے انتظار کرنا پڑے۔ سامنے والے مسافر کی ہانپتی کانپتی کیفیت دیکھ کر اس میں اس کی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ دیکھو تو‘ بندے کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ کیسا پسینے پسینے ہو رہا ہے؟ کالی جینس اور گرے کلر کا جیکیٹ۔ بے وقوف ہے کیا؟ اتنے ماڈرن ڈریس اپ کے اوپر چادر کیوں لپیٹ رکھی ہے اس نے؟ اور پھر دہلی میں ابھی اتنی سردی کہاں؟ عجیب شخص ہے، چادر سے ہی چہرہ صاف کر رہا ہے؟ گورا چٹا چہرہ...گھنی لمبی داڑھی...

داڑھی...؟

تو مسلمان ہے...؟

چہرہ صاف کرنے کے بعد اس نے اپنی داڑھی چادر کے نیچے کرلی ہے اور چہرے کا زیادہ تر حصہ چھالیا ہے۔

پر کیوں؟ یہ اپنا چہرہ اور داڑھی کیوں چھپا رہا ہے...؟

'.........؟'

اس نے محسوس کیا، پیروں کے نیچے سے سنسناہٹ جیسی کوئی چیز اوپر اس کے پورے جسم میں بھرنے لگی ہے۔

'یاتریوں سے انرودھ ہے کی کسی بھی سندگدھ ویکتی سے ساوَدھان رہیں...'

'ای موہمڈنون چین سے...'

گاڑی پوری رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔

اس نے بےچینی سے چشمے کا شیشہ صاف کر دوبارہ آنکھوں پر چڑھایا۔ رفتہ رفتہ اس کے اردگرد شک کا گھیرا کستا جارہا تھا۔ کہیں یہ...؟ کہیں کیا...؟ یقینی طور پر... یہ خود کو چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔ کیسا اکبکایا ہوا ہے۔ بےچین سا ہر چیز کو دیکھ رہا ہے...

اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ محسوس ہوا، اندر سے کوئی شئے اوپر آکر حلق کے پاس پھنس گئی ہے جس سے اس کی سانسوں میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ کھڑکی سے نم ہوا آنے کے باوجود اس کی پیشانی گیلی ہونے لگی۔ نظر ترچھی کر، چشمہ کے کنارہ سے وہ اس کے حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی ایک ایک جنبش پر دھیان دینے لگی۔

چوکنی نظر سے آس پاس دیکھ رہا ہے وہ۔ ایک ایک چیز کو بھانپ رہا ہے۔ کہیں....اسی ٹرین میں کچھ کرنے کا اس کا ارادہ تو نہیں؟ کنارے کی برتھ والے دونوں مسافروں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ دونوں تو جیسے ہر غم سے آزاد نیند کی آغوش میں ہیں۔

انھیں تو کسی انہونی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ گمان ہی نہیں کہ یہاں کیا ہونے والا ہے...؟

کیا کرے وہ...؟ کیا انہیں جگا کر بتائے، بھائی صاحب وہ آدمی... لیکن تب تک تو وہ... تڑ... تڑ... تڑ... نہ جانے کتنوں کو موت کی نیند سلا دے گا۔ نہیں نہیں، اس وقت کوئی بھی حرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ارے... وہ تو سوئی ہوئی اس کی بیٹی کو دیکھ رہا ہے... ا یکدم سے اس کی سانسیں رک گئیں۔ ہائے، میری بچّی... نہیں نہیں، اگر اس نے اس کی بچّی کو کچھ کیا تو وہ اس کا خون پی جائے گی... جان سے مار دے گی اُسے... بھلے وہ اسے بھی مار دے... اس کا چہرہ سخت ہوا تھا لیکن بدن کے سارے رواں بھی کھڑے تھے۔ گھبراہٹ ایسی کہ اپنی جگہ پر شل ہوگئی تھی جیسے۔

اس نے اپنا ہاتھ چادر کے اندر کرلیا ہے۔ ضرور... ضرور چادر کے اندر کچھ چھپا رکھا ہے اس نے؟ اے کے ۴۷ یا کوئی اور مہلک ہتھیار؟ لیکن اتنی سکیورٹی کے ہوتے...؟ ضرور پولیس والوں کو چکما دے کر اندر آیا ہوگا؟ ارے ہاں، یاد آیا۔ ٹرین کھل گئی تھی، جب تو دوڑ کر چڑھا تھا وہ۔ جب پولیس کے کھوجی کتّے بوگی کا چپّہ چپّہ سونگھ کر چلے گئے تھے۔

گاڑی کسی کراسنگ سے گزر رہی تھی۔ کھٹر پٹر کی تیز آواز کے ساتھ دائیں بائیں زور کے جھٹکے کھانے لگی تھی۔ اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ لیکن وہ... وہ تو ایکدم چست درست بیٹھا ہوا تھا۔ کیا غضب کی ٹریننگ ہوتی ہے ان کی۔ جسم میں بجلی بھری ہوتی ہے جیسے۔ جبھی تو پلک جھپکتے ہی قیامت ڈھا دیتے ہیں...

ارے، ارے، اٹھ کر کہاں جا رہا ہے وہ؟ ضرور بوگی کا معائنہ کرنے گیا ہوگا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھسک کر برتھ کے کنارے آئی، گردن باہر نکال کر جھانکا۔ ٹائلٹ کے اندر گھسا ہے۔ وہ جھانکتی رہی۔

بوگی کے اندر تقریباً سارے لوگ سو چکے تھے یا پھر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ خوفناک لگنے جیسی خاموشی مسلّط تھی۔ ایسی حالت میں تو وہ آرام سے ایک ایک کو مار دے

گا۔کوئی نہیں بچ پائے گا۔خوف اور خدشہ سے وہ لرز اٹھی۔کھسک کر سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔

بیٹی گہری نیند میں تھی۔اس کی اپنی نیند تو کافور ہو چکی تھی۔سامنے موت ہو تو نیند بھلا کیسے آئیگی؟ جانے کب کیا ہو جائے؟ وہ ابھی تک لوٹا نہیں؟ اتنی دیر تک ٹائلٹ میں کیا کر رہا ہے؟ کہیں ٹائلٹ میں ہی بم تو نہیں پلانٹ کر رہا ہے؟ اور اتنی دیر کیا کرے گا ٹائلٹ میں؟ سہمی سہمی پھر کنارے پر آکر جھانکنے لگی۔گیٹ کے پاس کھڑا موبائل سے باتیں کر رہا ہے۔ ضرور...اپنے آقاؤں سے بات کر رہا ہوگا؟ سارے حالات سے واقف کرا رہا ہوگا؟ اسے ہدایت دی جارہی ہوگی؟ کیسے کرنا ہے؟ کب کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے...؟ سب کچھ اسے بتایا جارہا ہوگا۔ جہاد کا گھونٹ پلایا جارہا ہوگا۔ جنت میں گھر بنانے کا خواب دکھایا جارہا ہوگا۔وہ جلدی جلدی اپنی گردن ہلا رہا ہے۔آقاؤں کے ایک ایک حکم پر لبیک کہہ رہا ہے۔

یا پھر وہ اپنے کسی ساتھی سے بات کر رہا ہوگا۔وہ اکیلا تو نہیں ہی ہوگا؟ اور بھی ساتھی ہوں گے اس کے۔شاید ابھی اسی ٹرین میں ہوں۔الگ الگ بوگی میں۔سب ایک دوسرے کے کانٹکٹ میں ہیں۔کب، کیسے، کیا کرنا ہے۔منصوبے کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔

آرہا ہے...آرہا ہے...وہ جلدی سے اپنی جگہ پر آگئی۔آنکھیں بند کرلیں، جیسے سونے کی کوشش کر رہی ہو۔ذرا سی آنکھیں وا کر، چشمہ کے پیچھے سے دیکھنے لگی۔اپنی برتھ پر بیٹھ گیا ہے۔ بیگ سرہانے رکھ کر لیٹ گیا ہے۔ارے،اس نے اس کے بیگ کی طرف تو دھیان ہی نہیں دیا۔ضرور اسی بیگ میں تباہی کا سارا سامان ہے۔ ورنہ اتنے جتن سے سرہانے نہیں رکھتا۔ برتھ کے نیچے ڈال دیتا۔

ٹی ٹی ای آیا تھا۔ٹکٹ مانگ رہا تھا۔ بھائی صاحب وہ آدمی...وہ ٹی ٹی ای کو بتانا چاہتی تھی، پر منہ سے لفظ باہر نہیں نکل پائے۔وہ لیٹا ہوا ہے، پر اس کا ہاتھ تو اس کے بیگ پر ہی ہے۔سہم گئی وہ۔ کچھ بولنے کا مطلب تھا، فوراً دھڑام..دھڑم.. لاشیں.. خون... چیتھڑے...

'ہاں بھئی...ٹکٹ...'ٹی ٹی ای اس سے مخاطب ہوا تھا۔اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا ٹکٹ دکھایا ہے۔کوشش کر رہا ہے، چہرہ سامنے نہ آئے۔آنکھیں اور ناک دکھائی دے رہی ہے
'آپ کی برتھ ٹونٹی سکس ہے...مڈل والی...'اس کا ٹکٹ دیکھ کر ٹی ٹی ای آگے بڑھ گیا تھا۔

...تو اس کی وہ برتھ نہیں ہے۔دوسرے کی برتھ پر جما ہوا ہے۔خالی پا کر بیٹھ گیا ہے۔نہیں نہیں، یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔

وہ جان سمجھ کر اپنی برتھ پر نہیں بیٹھا ہے تاکہ واردات کرنے کے بعد اس کی سہی نشان دہی نہ ہو سکے،اس کی شناخت نہ ہو سکے۔اس کے بارے میں سہی سہی کچھ پتہ نہ چل سکے۔ٹی ٹی ای بغل کے کمپارٹمنٹ میں ٹکٹ دیکھ رہا ہے۔وہ پیچھے سے جا کر ٹی ٹی ای کو بتا دینا چاہتی تھی۔ٹائلٹ...ہاں ٹائلٹ کا بہانا ٹھیک رہیگا۔وہ اٹھی، من ہی من کچھ پڑھتی آگے بڑھی۔ٹی ٹی ای کے پاس پہنچ ،مڑ کر پیچھے دیکھا۔کلیجہ دھک سے کر کے رہ گیا۔غضب کا عیار ہے وہ۔برتھ کے کنارے سے جھانک رہا ہے۔بس یونہی ٹائلٹ کی طرف گئی،لوٹ آئی الٹے پیر۔بیٹھی تو اس طرح جیسے جسم کی ساری طاقت نچوڑ لی گئی ہو۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی۔کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔علی گڑھ ہوگا۔علی گڑھ ہی تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی تھی۔پیٹھا والے، چائے والے آواز لگا رہے تھے۔وہ اپنی شیشہ لگی کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے۔اس کا موبائل بجا ہے۔وہ ایکدم سے چونک گیا ہے۔ جیب سے فون نکال کر نمبر دیکھتا ہے۔اٹھ کر کمپارٹمنٹ کی دوسری جانب چلا جاتا ہے۔

ضرور اسے اشارہ کیا گیا ہے۔اسی جگہ اڑا دینا ہے،ٹرین کو اور اسٹیشن کو بھی۔اے بھیا سنو...ایکدم بوکھلا کر پلیٹ فارم پر کسی کو پکار اٹھی۔مزید کچھ کہتی، وہ برتھ پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔سہم کر وہ کھڑکی سے چپک گئی۔

گاڑی کھل چکی تھی۔دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی تھی۔دھیرے دھیرے اس

کا خوف، اس کی دہشت بھی زور پکڑتی جا رہی تھی۔

اس نے لائٹ آف کر دی ہے۔ کمپارٹمنٹ میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ لیکن... اس نے لائٹ کیوں آف کر دی؟ اندھیرا کیوں کر دیا؟ کیا وہ تاریکی کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ بیگ کی زپ کھلنے کی آواز آئی ہے۔ اندھیرے میں بیگ کیوں کھول رہا ہے؟ کیا ہتھیار نکال رہا ہے؟ یا بم میں ٹائمر لگا رہا ہے؟ وہ آنکھیں پھیلا کر دیکھنے لگی۔ چشمہ کے باوجود کچھ صاف نہیں دکھ رہا۔ نہ جانے کیا کر رہا ہے وہ؟ نہ جانے کیا کرنے والا ہے؟

ضرور ہی فدائین ہے۔ لگتا ہے، خود کے ساتھ ہی ٹرین کو بھی اڑا دے گا۔ تب تو... وہ اور اس کی بچی... ان کے تو چیتھڑے بھی نہیں ملیں گے۔ ادھر راجیو سوچے گا، ہم لوگ پاپا کے پاس گئے ہیں... ادھر پاپا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے اور ہم لوگ... ہم لوگ... نہیں نہیں... بوگی کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔ انھیں تو پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ کال کے گال میں چلے جائیں گے۔ لیکن... لیکن... اس کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں۔ وہ تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

سامنے... اپنے سامنے... موت کو دیکھ رہی تھی۔ موت کو دیکھتے ہوئے مرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، اس کرب سے بڑی شدت سے گزر رہی تھی وہ۔

لیکن کیا وہ ایسے ہی مر جائے گی؟ مرنے سے پہلے، زندہ رہنے کے لیے، آخری کوشش سمجھ کر، کیا وہ کچھ نہیں کر سکتی؟ کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ اس پر جھپٹ پڑ سکتی ہے۔ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔ دبوچ کر شور مچا سکتی ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے نوچ سکتی ہے۔ اپنے ناخنوں سے اس کی آنکھیں پھوڑ سکتی ہے۔

ہاں ہاں، اسے اپنے آپ کو، اپنی بیٹی کو بچانا ہوگا۔ ورنہ راجیو کا تو سب کچھ ہی اجڑ جائے گا۔ اس کا تو ہم دونوں کے سوا کوئی ہے بھی نہیں۔ باپ رے، مجھ سے شادی کرنے کے لیے کون سی مصیبت نہیں جھیلی ہے اس نے۔ اس کے پریوار کا کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

سب ناراض تھے۔سب کی مخالفت سہہ کراس نے مجھ سے شادی کی تھی۔سب کے طعنے برداشت کراس نے مجھے اپنایا تھا۔میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے اس نے۔کتنا پیار کرتا ہے وہ ہم سے۔وہ تو جیتے جی مرجائے گا۔

اور...اس عمر میں پاپا تو ایکدم بے سہارا ہو جائیں گے۔ وقت بے وقت کون دیکھے گا ان کو؟ دور ہے، پر ماہ دو ماہ میں آکر اُن کو دیکھ تو لیتی ہے۔اتنے ہی سے ان کو کتنا بل مل جاتا ہے۔اور یہ، یہ میری بیٹی...ابھی دنیا ہی کہاں دیکھی ہے اس نے؟ ابھی ابھی تو آنکھ کھولی ہے۔اگلے ماہ تو اس کا ساتواں برتھ ڈے ہے۔کتنا انتظار ہے اس کو اپنے برتھ ڈے کا؟ کتنی تیاری کررکھی ہے اس نے؟ کیا ساری کی ساری تیاری...نہیں نہیں، اسے اس پر جھپٹ ہی پڑنا چاہیے۔موقع اچھا ہے۔ بیٹھا ہوا ہے۔اس سے قبل کہ بیگ سے ہتھیار نکالے وہ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔اگراس کی لمبی داڑھی پکڑ میں آجائے ،تب تو وہ ایکدم مجبور ہو جائے گا۔پوری طرح گرفت میں آجائے گا۔درد اتنا ہوگا کہ کچھ کر ہی نہیں پائے گا۔ ہاں ہاں، اسے اس پر حملہ کر ہی دینا چاہیے۔

ایک...دو...ارے باپ رے، کس طرح گھور رہا ہے وہ۔اس کے اندر چل رہی ساری باتوں کو پڑھ رہا ہے۔کتنا محتاط ہو گیا ہے۔کیا صرف بیگ میں ہی ہتھیار ہوں گے اس کے؟ چادر کے اندر بھی تو رکھے ہوں گے؟ ان کے پاس کیا نہیں ہوتا؟ چاقو سے لیکر اے کے ۴۷، ہتھ گولے، آرڈی اکس تک۔اور پھر جسم سے بھی تو گٹھیلا پھرتیلا ہے۔اس کے پاس پہنچنے سے قبل ہی اس کا کام تمام کردے گا۔تو پھر...پھر...

گاڑی اپنی پوری رفتار میں بھاگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو لانگھتی، تیز شور کرتی گزر رہی تھی۔ نہ جانے وقت بھی کیا ہوا تھا؟ پوری بوگی میں مرگھٹ جیسا سناٹا پسرا ہوا تھا۔تابوت میں رکھی لاش کی مانند لوگ اپنی اپنی برتھ پر سوئے ہوئے تھے۔ایک اسی کے کمپارٹمنٹ میں غیبی طور پر، لیکن دکھنے جیسی چیزیں چل رہی تھیں۔

کچھ تو کرنا ہی ہوگا؟ کیوں نہیں وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لے؟ اس کے پیر پکڑ لے؟ اس سے گڑگڑا کر بولے، دیکھو بھیّا، تمہاری بھی کوئی بہن ہوگی، میری بیٹی جیسی بیٹی ہوگی، کیا تمہارے دل میں رحم نہیں ہے؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟ اگر تمہاری بہن یا بیٹی کو کوئی مارے تو تم پر کیا بیتے گی؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ آخر یہ سب کیوں کرتے ہو تم لوگ؟ کیا ملتا ہے تمھیں بے قصوروں کا خون بہا کر؟ یہ اندھی لڑائی کیوں لڑ رہے ہو تم لوگ؟

اس طرح گڑگڑانے سے اسے ضرور دیا آجائے گی۔ بخش دے گا وہ ہمیں۔ ہاں، یہی ٹھیک رہے گا۔ ایسا ہی کرنا چاہیے۔

'بھائی صا...'

وہ بولنے کے لیے منہ کھولنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائیل کا الارم گھنگھنا اٹھا۔ اس کا مطلب صبح ہوگئی تھی۔ چھ بج گئے تھے؟ باہر کہرا ہے، صبح پتا نہیں چل رہی ہے لیکن یہ طے تھا ٹرین کانپور پہنچنے والی ہے۔ کانپور پہنچنے کے احساس سے ہی اس کے اندر توانائی بھر گئی۔ بس تھوڑی دیر میں ہی... بس تھوڑی دیر اور...

گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی۔ رفتار کم ہوتے ہی وہ اپنا بیگ اٹھا کر تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے، وہ یہیں اترے گا... نہیں، لگتا ہے یہیں کچھ کرے گا... اسی اسٹیشن پر...

'چلو بیٹے... اٹھو، جلدی چلو...' اس نے بیٹی کو نیچے اتارا۔ نیند سے جگی وہ آنکھیں ملنے لگی۔

'چلو بیٹے جلدی کرو...'

وہ سامان گھسیٹتے ہوئے گیٹ تک آئی۔ ٹرین رک چکی تھی۔ نیچے اتر کر ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ وہ گدھے کے سینگ کی طرح غائب

ہو چکا تھا۔

'یا اللہ... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے...'

اس کے منہ سے نکلا اور وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

OO

۔چہارسو، پاکستان، مارچ۔اپریل ۲۰۱۵

۔آج کل، نئی دہلی، اپریل ۲۰۱۳

چائمس

صغیر رحمانی

چائمس

☆مشرف عالم ذوقی کے ایک افسانے کے ارد گرد

کہیں پڑھا تھا ''عورت جب تک ماں نہیں بن جاتی، نامکمل رہتی ہے''۔
کیرتی... کیرتی سنہا... چونتیس سالہ عورت۔ آٹھ سال پہلے جس کی شادی مجھ سے ہوئی تھی، پورے نو مہینے کے لیے انکیوبیٹر میں چلی گئی تھی۔ غالباً یہی مدت ہوتی ہے عورت کے مکمل ہونے کی۔ میری پتنی کیرتی سنہا کو یقین تھا، جب وہ نو مہینے بعد انکیوبیٹر سے باہر نکلے گی، مکمل ہو چکی ہوگی۔ اس کا ادھورا پن ختم ہو چکا ہوگا۔
میں ہار چکا تھا۔
اس رات کیرتی سنہا ہی تھی جس نے میرا ہاتھ روک دیا تھا اور پھنکارتی ہوئی بولی تھی... ''تمھیں ایڈز ہے کیا جو ہر بار یہ جھلی چڑھا لیتے ہو؟'' اس کی آواز مجھے اندھیرے میں کوندتی ہوئی بجلی سی دکھی۔ کاش وہ میری بے بسی کو سمجھ رہی ہوتی لیکن تاریکی کے باوجود میں کیرتی سنہا کے چہرے پر نفرت اور غصے کا چنگھاڑتا سمندر ضرور دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں اور سانسوں کا ایسا بے ترتیب سلسلہ کہ پورا جسم پھول پچک رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھ پر جمود طاری ہو گیا تھا اور مجھے اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ پہلی بار کیرتی سنہا نے میرے اندر ٹھنڈی لہر پیدا کر دی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب برتتے ہوئے میں نے دھیرے سے کہا۔
''تم سمجھتی کیوں نہیں...؟''
اس نے بجلی کا لیمپ زمین پر دے مارا اور اندھیرے میں بھڑ بھڑاتی ہوئی کمرے

سے باہر نکل گئی تھی۔

دروازے کے پاس ٹنگا ہوا چائمس اس کے سر کے لمس سے بول پڑا تھا۔ ٹن ٹن...ٹنن...ن ن ن...میری کھیج کی انتہا نہ رہی۔ اس بے وقت کی ڈفلی کا مطلب...؟ کیرتی سنہا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ کسی کو سمجھ نہیں سکتا...پھر کیوں اٹھا لائی تھی اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ اسے بھی؟ رہنے دیتی وہیں اسے۔

اٹھ کر اسے شانت کروں یا پھر اسے کمرے سے باہر پھینک دوں، یہ خیال ابھی میرے من میں چل ہی رہا تھا کہ کیرتی سنہا دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور وہ پھر... ٹن...ٹنن...ٹن۔

''اِٹس ٹو مچ...'' میں چیخنا چاہ رہا تھا کہ کیرتی سنہا چیخ پڑی تھی۔

''کیا سمجھوں...؟ کب تک سمجھوں...؟ کچھ نہیں سمجھنا مجھے...آخر تم مجھے کیوں نہیں سمجھتے...؟''

جیسے بجلی کڑکی اور پھر خاموشی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ میں اندازہ لگا رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر رکھا ہوگا۔ سچ بھی تھا۔ منہ دوسری طرف کیے وہ سسک رہی تھی۔

''آخر تم مجھے کب سمجھو گے...؟'' ذرا دیر کی خاموشی پھر اس نے کہا۔ ''میں ادھوری ہوں پرشانت، ادھوری ہوں۔ مجھے اپنے جسم سے نفرت ہو رہی ہے...گھن آ رہی ہے مجھے...مکمل ہونا چاہتی ہوں...تم مجھے مکمل کیوں نہیں ہونے دیتے...؟ اس لج لجی شئے کی مدد لے کر میرے جسم کی بے عزتی کیوں کرتے ہو...؟ میں عورت ہوں مجھے گالی کیوں دیتے ہو...؟''

میرے اندر خاموشی بھری ہوئی تھی۔ کیرتی سنہا بول رہی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ مجھے کیا اور کیوں سمجھا رہی ہے؟ کیا وہ مجھے اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ میں اسے سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے اتنا بھی نہیں سمجھتی، اس خیال کو وہ کیوں گھر کرنے دے رہی ہے۔ دکھ اور

مایوسی کی یلغار سے میں بے چین ہو اٹھا تھا۔ ڈاکٹر... کچھ کہنے کی کوشش میں صرف ہکلا کر رہ گیا۔ اس کی معصوم اور بے قصور خواہش نے میرے پورے بدن میں لرزش بھر دی تھی جس کا احساس مجھے گہرے اندھیرے میں بھی ہو رہا تھا۔

میری پتنی کیرتی کی یہ ضد تھی کہ شاید ڈاکٹر کی ہدایت اسے یاد نہ تھی کہ شاید وہ اسے یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

''پر گننسی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

مگر ضد تھی اس کی۔

''پوری ہونا چاہتی ہوں...''

اور میں ہار گیا تھا۔

کیرتی سنہا انکیوبیٹر میں چلی گئی تھی۔ وہ مکمل ہو رہی تھی۔ وہ عورت بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

ڈاکٹر بار بار اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا... ''اِٹس ناٹ گڈ... اِٹس بیری ڈینجرس...''

اور میں بار بار اپنی ہتھیلی رگڑ رہا تھا۔

کیرتی سنہا میری پتنی بننے سے قبل میری شناسا تھی۔

بارش کی ایک شام تھی جب اس سے میری ملاقات بس اسٹاپ پر ہوئی تھی۔ میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی اور دو بار کافی کا پیالہ ختم ہونے تک جتنا ممکن ہو سکا تھا، اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا اور میرے بارے میں پوچھا تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ وہ بچوں کے ایک اسکول میں میوزک ٹیچر ہے۔ وہ نہ صرف میوزک ٹیچر ہے بلکہ شاستریہ سنگیت اس کی سانسوں میں بسا ہوا ہے۔ کھانے کے بغیر تو وہ زندہ رہ سکتی ہے لیکن سنگیت کے بنا نہیں۔ اس کا خوبصورت چھوٹا سا کمرہ اس کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ کمرے میں کئی طرح کے ساز و سامان سلیقے سے رکھے ہوئے تھے اور اس

کے ریاض کرنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔

لیکن، اس چھوٹے سے کمرے میں جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا وہ دروازے کے پاس ٹنگا ہوا چائمس تھا۔ کانسے کا بنا پانچ زنجیروں والا چائمس ،جس پر بھورے رنگ کی قلعی چڑھی ہوئی تھی اور جس کی سب سے نچلی زنجیر سے تار الٹک رہا تھا اور جو معمولی لمس سے ہی بول پڑتا تھا...ٹن ٹن...ٹنن...ٹن...آپ پڑھ رہے ہوں...کام کر رہے ہوں...کچھ سوچ رہے ہوں...اور تبھی اس کا ٹن ٹن...ٹنن...ن...ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نرم انگلیوں سے جسم کے اندر گدگدی کر رہا ہو...جیسے...

میں نے کیرتی سنہا سے کہا بھی...''مجھے سب سے زیادہ...''

بھاری پلکوں کو اٹھا کر اس نے اسے دیکھا تھا۔''آپ اس کی معصومیت پر جا رہے ہیں...جب کہ یہ نہایت ہی بے حس اور خود غرض قسم کی شئے ہے۔

دراصل آپ اچھے موڈ میں ہیں...اس کا سب سے بڑا عیب ہے کہ یہ سامنے والے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ آپ ہنس رہے ہیں...رو رہے ہیں...اس کو کوئی سروکار نہیں...بس اپنی دھن میں...ٹن...ٹن...ابھی کل کی ہی بات ہے۔ میرے اسکول میں ایک بچہ فیس نہ دے پانے کی وجہ...میں پورا دن اَپ سیٹ تھی۔ گھر پہنچی تو یہ جناب ٹن...ٹن...ٹن ن...ٹن...ہاؤ کرویل...میں تو ایک دم سے چیخ پڑی...'شٹ اَپ' لیکن...وہ ہاتھ رگڑ رہی تھی...''یہ کسی کو سمجھ نہیں سکتا...''

ایک بے جان شئے سے ایسی توقع...؟ کیرتی سنہا کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔''سنگیت زندگی کی علامت ہے...کہیں اس حالت میں بھی...یہ زندگی کا...''

''آپ فلاسفر ہیں...شاید...؟'' وہ مسکرائی تھی۔

''نہیں لیکھک ہوں...ہندی کا...'' میں بھی مسکرایا تھا۔

ہم دونوں مسکرانے لگے تھے۔

بطور جان پہچان یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ پھر اس کے بعد کئی ملاقاتیں....اور پھر ہم نے شادی کر لی تھی۔ شادی ہوئی اور مجھے کیرتی سنہا سے عشق ہو گیا۔ وہ میرے خیالوں کا ایک مستقل حصہ بن گئی۔ میں آفس جانے سے کترانے لگا۔ دوستوں کی ملاقاتوں سے بچنے لگا۔ گھر آئے مہمانوں سے چڑنے لگا۔ گویا کہ ایک ہی کوشش، کسی پہلوں وہ بٹے نہیں۔ پھر جب وہ سیڑھیوں سے گری، اس کے بچے دانی کا آپریشن ہوا اور وہ کوما میں چلی گئی تو یکلخت مجھے لگا وہ میرے لیے کتنی ناگزیر ہے۔ اس کو منہا کر کے تو میری زندگی کا کوئی معنی ہی نہیں بچتا تھا۔

ڈاکٹر نے تسلی دی تھی۔ ''بچ جائے گی لیکن مستقبل میں پرگننسی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں...'' ایک اس دن مجھ پر دہشت طاری ہوئی تھی اور ایک آج ڈاکٹر نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ''اِٹس ناٹ گڈ... اِٹس بیری...'' جامد نظروں سے میں کیرتی سنہا کا چہرہ تکتا رہا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔ ہونٹوں کی دھاریاں پھیل گئی تھیں۔ ''کیا ہوگا...؟ مر جاؤں گی نا...بس... '' دوسرے پل کیرتی میری بانہوں میں تھی۔ جی چاہتا تھا اسے اپنے اندر جذب کر لوں۔

لیکن وہ پوری ہو رہی تھی۔

چوتھے ماہ سے اس کی آنکھوں کا خمار بڑھنے لگا تھا۔ وہ گھنٹوں آنکھوں کو بند کیے دیکھتی رہتی۔ محسوس کرتی رہتی۔ بے وجہ مسکراتی رہتی۔ لگتا وہ سنگیت سن رہی ہے، لگتا وہ تھرک رہی ہے۔ کئی بار ٹوکا میں نے۔ وہ مجھے نہیں سن پاتی تھی۔ بس خود کو سن رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی خود کو مکمل ہوتے۔ ایک عورت کا مکمل ہونا کتنے اَن چھوئے سپنوں کو جنم دیتا ہے، یہ کیرتی سنہا کی آنکھوں سے صاف عیاں ہو رہا تھا۔ پانچواں مہینہ چڑھتے ہی کیرتی نشہ بن گئی۔ اس کے پاؤں سہی جگہ نہیں پڑتے۔ چلتی تو ڈگمگاتی۔ کمر اور کولہے بھر گئے۔ اس پر دلکشی کا غلبہ ہوا تھا۔

چہرے کا ابرق گاڑھا ہو کر تپ تپ کرنے لگا تھا۔ رہ رہ کر ہونٹوں کی دھاریاں پھیل جاتیں۔ سانسوں کی رفتار بتاتی، جذبہ و احساس کا تلاطم زور پکڑ رہا ہے۔

کنواری خوشیاں اس کی چھاتی میں اچھل کود مچارہی تھیں۔

خواب میں ڈوبی بستر پر لیٹی رہتی کیرتی سنہا۔ پشت سے تکیہ لگا تا تو وہ اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیتی۔

''خوش ہونا...؟''

اس کے بال سہلاتے میرے ہاتھ رک جاتے۔ اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ جذبات سے پُر اُس کا چہرہ مجھے خواب ناک لگتا۔

ٹھہر ٹھہر کر کہتی... ''میں تمہاری شکر گزار ہوں پرشانت... تھینک یو... ویری مچ...''

''تم خوش ہو...؟'' میرے گلے سے جو آواز نکلتی، بخدا مجھے خود پہچان میں نہیں آتی۔

''یو... آخر تم مجھے کب سمجھوں گے...؟'' قدرے زچ ہو کر وہ کہتی۔

اس کی بات سن کر میں کہیں دور چلا جاتا۔ واپس آتا اور پوچھتا۔ ''اچھا... کیا بناؤ گی اُسے...؟''

''ویل...'' پیشانی پر انگلی رکھ کر سوچتی اور چہک کر کہتی... ''کچھ بھی... پر ہندی کا لیکھک نہیں...''

وہ ہنس دیتی۔ میں ہنس دیتا۔

کتنی امید افزا تھی ہماری ہنسی۔

ساتویں مہینے کے شروعاتی دنوں میں سے کسی ایک دن کیرتی سنہا درد سے چھٹ پٹانے لگی۔

آٹو... ٹیکسی... نہیں، امبولینس...

کیرتی سنہا اسپتال پہنچادی گئی۔

وہ ہوئی نہیں تھی۔ اسے دستانہ چڑھے ہاتھوں نے کیرتی سنہا کا پیٹ چاک کر کے

باہر نکالا تھا۔ اگر نہیں نکالی جاتی تو کیرتی سنہا... کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ صرف چھ مہینے اور کچھ دنوں کی تھی۔ آدھی ادھوری۔ کیرتی سنہا بے ہوش پڑی تھی۔ جو بھی فیصلہ کرنا تھا، مجھے کرنا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

کیرتی سنہا پوری ہو گئی تھی... مگر وہ...، ''او کے... او کے...'' ڈاکٹر نے کہا تھا۔ شاید وہ ہارا نہیں تھا ابھی۔ ''ہم اسے بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اکثر ہی ایسا ہوتا ہے اور اکثر ہی انہیں بچا لیا جاتا ہے...'' ڈاکٹر نے اپنی ساری صلاحیتوں کا استعمال کیا تھا... ''اس کے بعد دستانہ پہنے ہاتھوں نے ٹھیک اسی طرح اسے ایک دوسرے شکم میں منتقل کر دیا جس طرح انھوں نے اسے کیرتی سنہا کے شکم سے نکالا تھا۔

وہ جتنا بھی بنی تھی اس سے آگے بنے گی۔

کیرتی سنہا کو ہوش آیا تو اپنا خالی پیٹ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ٹانکے کی سلائی اور پٹی کی موٹی تہہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایسے سہلانے لگی جیسے اسے ڈھونڈ رہی ہو۔

لیکن وہ وہاں تھی کہاں؟

وہ تو ایک دوسرے شکم میں بن رہی تھی۔ کیرتی سنہا کی پلکوں کے دونوں کناروں سے دھار بہہ چلی۔

''تم مکمل ہر چکی ہو...'' میں نزدیک کھڑا اسے اپنے ہونے کا احساس کرانے لگا۔

''لیکن وہ ابھی بن رہی ہے...''

اس نے غیر یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''کہاں ہے وہ...؟'' جیسے اس کے ساتھ ساتھ میں وہاں نہ تھا۔ ''بس یہی کہیں... لیکن وہ بن رہی ہے...''

میں اپنی موجودگی کے لیے لگاتار کوشاں تھا۔

''بن رہی ہے...؟ کیا وہ...؟'' اس کی آواز ٹوٹ پھوٹ کر قسطوں میں باہر آئی۔

''فکر نہ کرو... وہ ایک دوسرے ''شکم'' میں اپنا ادھورا پن دور کر رہی ہے... بلکہ اپنی

تکمیل کے بقیہ اوقات گزار رہی ہے...''

مجھے اب بھی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے کے ریشے ریشے کو پڑھ رہی تھی۔

''یقین کروں...تم مکمل ہوچکی ہو...''میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

کیرتی سنہا گھر آ گئی۔

دیکھوتو سب کچھ ویسا ہی...اسی طرح...جس طرح تم چھوڑ کر گئی تھیں...دیواروں پر لگائی ہوئی تمہاری پینٹنگس...صوفوں کے کور پر تمہاری کی ہوئی کشیدہ کاری... کھڑکی دروازوں کے پردے...اور وہ تمہارا چائمس...ٹن ٹن...ٹن...ٹنن...تم مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہو؟...''

''مجھے اس کے پاس لے چلو پرشانت...''

پھر ضد...کیا کروں گی اس کے پاس جا کر...؟

کہنا چاہ رہا تھا لیکن رک گیا کہ اس کے بعد وہ یہی کہتی۔''آخر تم مجھے سمجھتے کیوں نہیں...؟''

...اور مجھے احساس تھا، کیرتی سنہا کو اسے بنتے ہوئے دیکھنا ٹھیک نہیں جب کہ اب وہ اس کے اندر نہیں بن رہی تھی۔

کچھ وقت لگا لیکن کیرتی سنبھلنے لگی تھی۔ میرے لیے اچھا تھا ادھر کیرتی کا سنبھلنا اور ادھر اس کا بننا۔

میں ہر روز اسپتال جاتا۔ وہ شیشے کے گھر میں اطمینان سے پڑی ہوتی تھی اور اس کے بہت چھوٹے سے منہ میں آکسیجن کی نلی لگی رہتی تھی۔ وہ لگاتار بن رہی تھی۔ شیشے کے اس گھر میں اسے وہ سارا ماحول مل رہا تھا جو کیرتی سنہا کے شکم میں اسے ملتا تھا۔

تین مہینے لگے۔ کیرتی سنہا پوری طرح سنبھل گئی تھی اور وہ شاید پوری طرح بن

گئی تھی۔

''ڈاکٹر...''

''یس...شی از او کے...''

وہ پوری طرح بن کر پہلی بار گھر آئی تو میں نے کیرتی سنہا سے کہا۔

''تم تو اس کی آدھی ماں ہو...''

''کیا مطلب...؟'' کیرتی سنہا کی آنکھوں میں تشویش کے تاثر پیدا ہوئے۔

''مطلب یہ کہ تم نے اسے آدھا بنایا ہے...مکمل تو یہ...اس لیے آدھی ماں وہ...''

''اوہ...مائی گاڈ'' کیرتی سنہا کے چہرے کی کسی تنی ہوئی طنابیں اچانک ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...''

وہ ہنسنے لگی۔ میں ہنسنے لگا۔

کتنی بے لوث تھی ہماری ہنسی......

اچانک وہ چپ ہو گئی۔ کچھ سوچنے لگی۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جھجھکتے ہوئے بولی۔

''یہ پوری طرح... پوری ہو گئی ہے نا...؟''

مجھے عجیب لگی اس کی آواز۔ پوری طرح پوری ہونے کا مطلب؟ پوری طرح ہی تو پوری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا...''پوری ہو گئی ہے... پوری طرح مکمل...شی از او کے...'' پورے تین مہینے اس کی دوسری والی آدھی ماں نے اپنے شکم میں رکھا تھا۔اس سے قبل کیرتی سنہا نے چھ مہینے اپنے شکم میں۔ چھ اور تین نو ہوتے ہیں۔انسانی جان کے مکمل ہونے کا یہی وقفہ ہوتا ہے۔دو چار دن کم یا زیادہ۔ پھر کیرتی سنہا کا ایسا سوال کوئی معنی رکھتا ہے کیا؟ کیا اسے اس کے پوری طرح پورا ہونے کا یقین نہیں

ہے؟ لیکن اس یقین کے نہیں ہونے کی وجہ؟

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی...

''یہ کچھ بول نہیں رہی... مجھ سے باتیں نہیں کر رہی ہے؟''

''لیکن تمھیں یقین کرنا چاہئے...''

میں کیرتی سنہا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے پوری طرح یقین تھا۔ وہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے۔ میں خوش تھا اور اپنے لکھنے کی ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔ کیرتی سنہا بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔

اس رات میری کہانی میں اس کا باضابطہ اور مکمل جنم ہوا۔ میں نے کیرتی کو دکھایا۔ کیسے زندگی سے بھر پور مسکراہٹ لیے اس کے ہونٹ پھیل سکڑ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے پتلی سی نلی لگی ہوئی تھی جس کے ذریعہ کوئی پتلی سی چیز اس کے پیٹ کے اندر جا رہی تھی۔

وہ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کے دور سے گزر رہی تھی۔

ڈاکٹر ہر روز آتا، دیکھتا اور اطمینان دلا کر جاتا تھا... ''شی از نارمل'' مہنگا اور تجربہ کار ڈاکٹر... مجھے بھروسہ تھا۔ لیکن کیرتی سنہا... اسے تشویش تھی... یہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے نا...؟''

میں انگلیوں کے اشارے سے پھیلتے سکڑتے زندگی سے بھر پور اس کے ہونٹ دکھاتا... تمہاری بے یقینی کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں... ڈونٹ وری... شی از نارمل... مجھے لگا میرے منہ سے ڈاکٹر بول رہا ہے۔ ہڑبڑا کر میں نے پالنے میں دیکھا۔ نلی کے ذریعہ کچھ اس کے اندر جا رہا تھا۔ وہ زندہ رہنے کے لیے... بٹ شی از...'' میں نے کیرتی سنہا کو اطمینان دلانا چاہا... اگر ذرا بھی نامکمل ہوتی تو ڈاکٹر اسے گھر نہیں بھیجتا... کیرتی نے پہلی بار میری بات غور سے سنی اور شاید پہلی بار اس نے اس پر یقین کرنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے سے اس بات کی جھلک مل رہی تھی۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے۔ لڑ رہی ہے اندر ہی

اندر، جب کہ اسے نہیں پتا، اس اندر کی لڑائی میں ہار کس کی ہوگی اور جیت کس کی؟

''اگر یہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے تو جلدی سے بڑی کیوں نہیں ہوتی...دودھ کا گلاس پھینک کیوں نہیں دیتی...؟ اور میں اسے ڈانٹ کیوں نہیں رہی...'' لڑکی بی ہیو یور سیلف...''

کیرتی سنہا کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا، سوائے اس کے کہ غور سے اسے دیکھنے لگتا۔ دیکھ چکنے کے بعد جیسے تیسے خود کو تسلی دیتا، اتنی جلدی کیسے کیرتی سنہا...؟''

''مگر یہ بڑی کیوں نہیں ہو جاتی...؟'' میری تسلی کا کھنڈر ڈاکٹر نے دیکھا تو مسکرا پڑا۔

''ہیو پیشنس... تھنگس آر امپر وونگ...''

مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

کتنی معنی خیز تھی ہماری مسکراہٹ؟

''بچوں کے ہونے کے بعد مرد حاشیے پر چلا جاتا ہے۔'' عام طور پر مردوں کی یہ شکایت ہوا کرتی ہے۔ میری بھی تھی۔

''ایسا کیوں کہتے ہو...'' جیسے، کہیں سے مستعار لیے ہوئے لفظ کیرتی سنہا نے ادا کیے۔

''اس لیے کہ اب آفس کے لیے مجھے خود تیار ہونا پڑتا ہے...خواہش ہونے پر چائے خود سے بنانا پڑتی ہے...رات کو مجھے کتابیں پڑھتے ہوئے سونا پڑتا ہے...''

ٹھیک ہی تو ہے...'' یہ الفاظ بھی اس کے نہیں تھے۔ میں جھلا اٹھا۔

''ٹھیک ہے...؟'' میں اس کی طرف لپکا...''کیرتی سنہا...'' وہ کھلکھلاتی ہوئی بچنے لگی۔ میں مرد تھا، مرد ہمیشہ حملہ آور اور اکثر اوقات فاتح ہوتا ہے۔

کیرتی سنہا میری گرفت میں آگئی تھی۔

''چھوڑونا'' وہ کسمسا رہی تھی۔

''ہرگز نہیں...''

''وہ دیکھ لے گی...''

''ابھی چھوٹی ہے...''

کیرتی سنہا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ''وہ بڑی کب ہوگی پرشانت...؟ وہ اسکول کب جائے گی...؟''

''پرشانت سنہا...'' خواہش ہوئی کہ میں اپنا نام زور سے چیخوں۔ لیکن نہیں، ایسا کچھ نہیں کرسکتا تھا میں۔ ایسا کچھ نہیں کیا میں نے۔ بس اسے دیکھتے ہوئے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

رات کو کیرتی سنہا میرے قریب آئی تھی۔

'تم آئسولیٹ ہورہے ہو پرشانت...؟'' اس نے میرے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ ''میں کیا کروں پرشانت جب سے وہ ہوئی ہے... بلکہ جب سے وہ بن کر آئی ہے... نہ جانے کیوں مجھے... پوری طرح پوری... پرشانت پلیز... مجھے سمجھنے کی...'' وہ میرے سر کو اپنے اندر بھینچتی جا رہی تھی، میں اس کے اندر سماتا جا رہا تھا ذرا دیر بعد، وہ مجھے پوری طرح اپنے اندر جذب کر چکی تھی۔

اور پھر ایک دن...

پرشانت... پرشانت... صبح صبح کیرتی سنہا چیخنے لگی تھی۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے آیا تھا۔

''پرشانت وہ نہیں ہے...'' وہ میرے جسم سے لپٹ کر مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ''وہ نہیں ہے پرشانت...''

میں ہکا بکا پالنے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہوگی... یہی کہیں ہر گی... کہاں جائے گی... بستر پر ہوگی... اس کے نیچے... تکیے کے پاس... کچن میں... باہر کہیں... برآمدے میں... کہیں نہیں... پھر کہاں...؟''

کیرتی سنہا مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔ اور ذرا دیر بعد وہ اسپتال میں تھی۔

گویا اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا۔ ایک ایک انکیوبیٹر کو کھنگال رہی تھی۔ ''نہیں ہے... نہیں ہے پرشانت... وہ یہاں بھی نہیں ہے...''

''پرشانت... پرشانت...'' وہ پھر سے مجھے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔

میں سچ کہتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، غیر متوقع طور پر میری زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اچانک رونما ہوئے ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیرتی سنہا... مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ دکھ سے پاگل ہو رہی تھی۔ درد نے اس کے انگ انگ کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ مکمل ہو کر بھی....

اور میں...

''کیرتی سنہا میں بھی... میں بھی کچھ تھا اس کا...'' میرے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔
''آخر... تم کیرتی سنہا... مجھے...''

میرے اندر کی چیخ اندر ہی رہی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''آؤ چلو، میں تمھیں، اسے اپنی کہانیوں میں بڑا ہوتے دکھاتا ہوں۔''

میں، پرشانت سنہا، گھر پہنچ کر کمرے میں داخل ہوا تو میرے سر سے...

ٹن ٹن... ٹنن... ٹن... ٹنن...

OO

آج کل، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۳

ناف کے نیچے

صغیر رحمانی

ناف کے نیچے

مقام: شمالی ٹولے کا ایک تاریک کمرہ

...اس سے قبل کہ اژدہا اسے اپنے دہانہ میں بھر لیتا اس کی نیند ٹوٹ گئی اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا ایک ایک عضو پھوڑے کی شکل میں ٹیس رہا ہے۔ وہ پسینے سے تر بہ تر ہو گیا تھا اور پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھنے لگا تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔

آج پھر اس نے وہی خواب دیکھا تھا۔ ایک طویل و عریض بد ہیئت اژدہا اسے چاروں جانب سے اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہے اور اپنے دہانہ کو پھیلا کر اسے ثابت نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے جسم کی ہڈیاں چٹک رہی ہیں اور روح گھٹتی جا رہی ہے۔ اس سے قبل کہ اس کی روح فنا ہو جاتی اور وہ ہیبت ناک اژدہا اسے اپنے سخت دہانہ کی گرفت میں لے لیتا... اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ خواب وہ مسلسل کئی راتوں سے دیکھ رہا تھا۔ خواب اس قدر ڈراؤنا تھا کہ اس کا اثر اس کے ہوش و حواس پر کئی کئی دنوں تک مسلط رہتا تھا اور آج تو اس کا پورا جسم گھاؤ ہی بنا ہوا تھا۔

اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ اسی کیفیت میں اس نے بمشکل گردن گھما کر بغل میں سو رہی اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا۔ تاریکی میں ان کی ناک سے نکلنے والی گھرگھراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور چارپائی سے پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پیاس کی شدت کے باوجود اندھیرے میں پانی کے مٹکے تک جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو

رہی تھی۔ چارپائی سے پیر لٹکائے وہ گہری سانسیں لیتا رہا۔

اس کی عمر کوئی ایک پینتیس سال تھی۔ اکہرا جسم اور درمیانہ قد ہونے کی وجہ سے ڈنڈوں کی مار اس کے اندر اندر تک حائل کرگئی تھی۔ بیوی نے ہلدی اور چونے کے مرکبات پورے جسم پر مل تو دیا تھا لیکن اسنے تنبیہ بھی کیا تھا، جب جب پروا چلے گی، انگ انگ ٹیسے گا اور اس کا انگ انگ ٹیس رہا تھا۔

دفعتاً اس کے کانوں میں ایک مترنم اور قدرے مانوس سی آواز ٹکرانے لگی۔ یہ گاؤں کی گول گنبد والی عبادت گاہ سے آنے والی آواز تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رات ڈھل چکی ہے اور اب نور کا تڑکا پھیلنے ہی والا ہے۔ پورے دن میں کل پانچ دفعہ عبادت کے لیے اس آواز کے ذریعہ لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ بلاتفریق سب لوگ ایک ساتھ اپنے معبود کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے حواس ذرا بحال ہونے لگے۔ ایک ایک منظر یاد آنے لگا۔ نکیلے گنبد وای عبادت گاہ... چارپائی... چپل... ڈنڈے...

اس کے باپ کی ایسی ہی ٹیس سے موت واقع ہوئی تھی۔ ٹولے کی سامنے والی سڑک سے بڑے گھر کی سواری نکل رہی تھی۔ شراب کے نشے میں اس کا باپ اپنے گھر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس وقت تو سواری نکل گئی تھی مگر شام کو بلاوا آ گیا تھا۔ بڑے گھر کی دالان کے ستون سے باندھ کر اس پر اتنے ڈنڈے برسائے گئے تھے کہ اس کا باپ نیم مردہ ہوگیا تھا۔

کسی کم ذات کی یہ مجال کہ سامنے سے اشراف گزریں اور وہ چارپائی پر بیٹھا رہ جائے۔ یہ تو خوش آئند بات نہیں ہے۔ یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ بڑے گھر کے لوگوں کا خیال ہے کہ... اس طرح مذہب کا خطرے میں پڑنا لازم ہے اور جب مذہب خطرے میں پڑے گا تو معاشرتی نظام کو درہم برہم ہونے سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ ہر کسی کے لیے حد مقرر ہے... آج معاشرے میں سکون اور امن و امان کا فقدان اس لیے ہے کہ طے شدہ

کام طے شدہ حدوں کے اندر نہیں کیے جا رہے ہیں۔ایسی حالت میں افراتفری مچنا فطری ہے۔ مذہب کا پیمانہ ٹوٹنا لازمی ہے اور جب یہ پیمانہ ٹوٹے گا تو معاشرے کا تانا بانا بکھر جائے گا...

اس کے باپ نے مذہب کو خطرے میں ڈالا تھا۔ معاشرتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ مجرم تھا۔

وہ اپنے باپ کے نیم جاں جسم کو اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس کا لاغر باپ بستر پر پڑا کھو...کھو...کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔اس کے سینے میں اتنی شدید چوٹ تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک نہ جی سکا لیکن مرنے سے قبل اس کے پاس ایک امانت تھی جسے اس نے اس کے حوالے کیا تھا۔اور وہ تھی پشتینی نصیحت...

'ہم ناف کے نیچے والے ہیں، ناف کے اوپر والوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی ہمارا فرض ہے۔ مجھ سے بھول ہوئی۔تم ایسی بھول نہ کرنا۔اپنی حد کو عبور نہ کرنا۔'

اس کے باپ نے اسے نصیحت کی تھی۔اس کے باپ کو اس کے باپ یعنی اس کے دادا نے یہ نصیحت کی تھی اور اس کے دادا کو اس کے پردادا نے۔اسی طرح یہ نصیحت نسل در نسل ان کے درمیان چلی آ رہی تھی۔اب یہ نصیحت اس کے معرفت اس کے بیٹے تک پہنچے گی۔اس کے باپ تک اس نصیحت کی خوب پاسداری ہوئی لیکن اس سے بھول ہوگئی۔وہ بھول گیا۔اپنے باپ کی نصیحت بھول گیا۔پشتینی نصیحت کو بھول گیا۔

کل کی بات ہے...

بڑے گھروں کے یہاں سے خدمت گزار کر واپس لوٹ رہا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔بھیگنے سے بچنے کے لیے نکیلے گنبد والی عبادت گاہ کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ناپاک کر دیا اس نے عبادت گاہ کو۔ پھر کیا تھا، اس کا بھی بلاوا آ گیا۔اس نے بہت معافی مانگی، زمین پر ناک رگڑی۔ بیوی نے جان بخش دینے کی منّت کی۔اسے بھی ذلیل کیا گیا کہ اپنے مرد

کی خبر پا کر وہ بدحواس چپل پہنے گاؤں میں بھاگتی آ گئی تھی۔اس کی جان تو بخش دی گئی لیکن پورا جسم ڈنڈوں سے چور کر دیا گیا۔

اسے اپنے سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے گردن گھما کر ایک بار پھر اندھیرے میں سو رہی اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا۔ان کو دیکھتے ہوئے اس کے اندرون میں تلاطم سا برپا۔'نہیں، ہرگز نہیں...وہ اپنے بیٹے تک اس پشتینی نصیحت کو منتقل نہیں کرے گا۔'

کچھ لمحوں تک ان کی جانب دیکھتے رہنے کے بعد وہ آہستگی کے ساتھ چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔تاریکی کے باوجود اسے اندازہ تھا کہ دروازہ کس جانب ہے۔وہ دھیرے دھیرے دروازے کی جانب بڑھا۔اس نے دروازہ کھولا تو ایک خوش گوار احساس سے بھر اُٹھا۔کیا ہی خوب منظر تھا۔تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور نسیم سحر میں لپٹی ہوئی نرم روشنی اس کا استقبال کر رہی تھی۔اس کے انگ انگ میں پیوست درد کو سہلا رہی تھی۔لمحہ بھر کے لیے وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔وہ کھڑا روشنی کو پیتا رہا۔دفعتاً اس کے اندرون میں عجیب سی ہلچل ہوئی اور بیک وقت خیال گزرا کہ اندر واپس لوٹ جائے اور بستر پر جا کر سو جائے۔اس نے گردن گھما کر اندر دیکھا۔اس نے دیکھا اس کے بستر پر، جہاں وہ لیٹا ہوا تھا، وہاں ایک بڑا سا اژدہا بیٹھا ہوا تھا اور جو اُس کے بیٹے کو خوں بار آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔ایک بار پھر اس کے ہوش و حواس فاختہ ہو گئے۔اس نے گھبرا کر نگاہیں ہٹا لیں۔ دروازے پر کھڑا وہ گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔کچھ لمحہ بعد اس نے دل کو مضبوط کیا اور لرزتے قدموں سے باہر آ گیا۔

تقریباً پچیس تیس گری پڑی، ٹوٹی بکھری جھونپڑیوں اور کچے مکانوں والا اس کا ٹولہ شمن پورہ گاؤں کے شمالی حصے میں واقع تھا۔وہ اپنے ٹولے سے نکل کر گاؤں میں داخل ہونے والی سڑک پر آ گیا۔وہ دوراہے پر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے گاؤں کے مکانوں کی

شروعات ہوتی تھی۔ سیدھی سڑک گاؤں کی گول گنبد والی عبادت گاہ کی طرف جاتی تھی اور سیدھے ہاتھ کی سڑک نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کی طرف۔

نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ سے بھی آواز گونجنے لگی تھی۔ وہاں بھی عبادت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چیخ اٹھا اور اس کے اندرون میں ایک بار پھر تلاطم سا برپا۔ اس نے یاس و حسرت بھری نگاہوں سے نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کی طرف دیکھا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ چند ثانیہ وہ بے حس بنا کھڑا رہا پھر سیدھے رستے پر بڑھ گیا۔ وہ جوں جوں گول گنبد والی عبادت گاہ کے قریب پہنچ رہا تھا، اس کے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ اس کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے اکا دکا لوگ صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اُن میں سے معتبر اور نمایاں سا دکھنے والا ایک شخص باہر نکلا تو وہ قدرے لپکتے ہوئے اس کے پاس پہنچا۔

'سنیے، سنیے... مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ رکیے مالک...' وہ سرگوشی میں چلایا۔

اس شخص نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ 'کون ہو بھائی، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'

'میں... میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ... کہ کیا میں بھی آپ کی اس عبادت گاہ میں...' اس نے عبادت گاہ کی طرف انگلی اٹھائی۔ '... عبادت کر سکتا ہوں؟ کوئی روک ٹوک تو نہیں ہو گی نا؟'

'یہ عبادت گاہ میری نہیں ہے بھائی۔ یہ تو اس کی ہے جو ایک ہے اور جو سب کا مالک ہے۔ اس ایک کو ماننے والا کوئی بھی اس میں عبادت کر سکتا ہے۔'

'اگر میں اس کو ماننے لگوں تو کیا میں بھی اس میں عبادت کر سکتا ہوں...؟'

'ہاں... ہاں... کر سکتے ہو... پر تم ہو کون؟'

'میں... میں... اسی گاؤں کے 'شمالی ٹولہ' پر رہتا ہوں مالک...' اس کی آواز میں

قدرے لکنت کی آمیزش تھی۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔

صاف روشنی میں وہ شخص اسے بغور دیکھے جا رہا تھا۔

مقام۔ گول گنبد والی عبادت گاہ کا صحن

شام کی عبادت کے بعد وہ سب وہاں یکجا ہوئے تھے۔ سب خاموش تھے اور غور و خوض میں غرق تھے۔ بظاہر تو یہ محض ایک تجویز تھی لیکن اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا لازمی تھا۔

'مجھے لگتا ہے، ہمیں اسے اپنی جماعت میں شامل کر لینا چاہیے۔' کچھ لمحہ کے بعد ان میں سے ایک شخص نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

'لیکن جناب یہ بھی تو سوچیے کہ اس کا اثر کیا ہوگا؟' ایک دوسرے شخص نے اندیشے کا اظہار کیا۔

پہلے والے شخص نے اپنی گردن کو پھر جنبش دی۔ 'اثر کیا ہوگا بھئی، ہم تو اس کے پاس گئے نہیں ہیں۔ اس تجویز کو لے کر وہ خود آیا ہے۔ اس نے خود سے اپنا منشا ظاہر کیا ہے اور یہ تو اچھی بات ہے کہ اس طرح ہمارا حلقہ وسیع ہوگا۔ ہماری مقدس کتاب بھی تو یہی کہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تبلیغ کرو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے میں شامل کرو۔ یہ شخص تو خود سے چل کر ہمارے پاس آیا ہے اور پھر ہمارے ملک کے آئین میں بھی درج ہے کہ کوئی بھی بالغ فرد اُن تمام معاملات میں اپنا فیصلہ کرنے کے لیے خود مختار ہے۔' اس شخص نے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

'لیکن حضور ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہوگا کہ اس کا اصل منشا کیا ہے؟ کہیں اس طرح ہمیں فائدہ کے بجائے نقصان نہ پہنچ جائے؟' ایک دوسرے نے پہلے والے شخص سے سوال کیا۔

'ارے بھائی، ظاہر سی بات ہے وہ ہمارے یہاں کی خوبیوں اوراچھائیوں سے متاثر ہوکر ہی ہم میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ آخر ہماری مثل... ہماری نظیر کہیں اور ہے کیا؟' ایک شخص نے فخریہ لہجے میں کہا۔ 'ہمارے یہاں کی مساوات دیکھو۔ ہمارے یہاں کی اخوت دیکھو۔ ہمارے یہاں کا عدل دیکھو۔ ہمارے یہاں کی یکجہتی دیکھو۔ کیا کیا دیکھو گے۔ ہم بلا تفریق شانہ بہ شانہ ہوکر عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا امام کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے مقدس صحیفے کوئی بھی پڑھ سن سکتا ہے۔ ہمارے مابین کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی بندش نہیں۔ ہم سب ایک رب کو ماننے والے ہیں۔' ایک سانس میں بولنے کے بعد اس شخص نے ذرا تحمل سے کام لیا اور پھر آگے کی بات پوری کی۔ 'کیا یہ سب کہیں اور ملے گا؟'

وہاں خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ وہ شخص اپنی تقریر کا اثر جاننے کے لیے وہاں موجود ایک ایک فرد کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔

'آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ یقیناً وہ ہماری ان منفرد اور اعلا خصوصیات کی بنا پر ہی ہماری جانب راغب ہوا ہے۔' ایک شخص نے پہلے والے شخص کی حمایت میں دھیرے سے کہا۔

'چلیے مان لیتے ہیں کہ وہ ہماری اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر ہم میں شامل ہونا چاہتا ہے لیکن اس کی طرز زندگی تو الگ رہی ہے؟ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمارا طریقۂ کار اپنا سکے گا؟' بولنے والے نے اپنی دانست میں دور کی کوڑی پیش کی۔

'دیکھیے حضرات، ایک محاورہ ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے... صحبت میں رہے گا تو کیا کچھ نہیں سیکھ جائے گا۔ ہم لوگ یہ نہ بھولیں کہ ہم کوئی براہ راست کھجوروں کے دیس سے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے آباواجداد یہیں کے تھے اور دوسرے حلقے سے ہی اس میں منتقل ہوئے ہیں لیکن کیا کوئی ہمیں دیکھ کر آج یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم پہلے کچھ اور تھے؟'

شاید بولنے والے نے کچھ تلخ مثال پیش کر دی تھی۔ کئی لوگوں نے اسے اضطراب میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس شخص کے بولنے کے بعد کافی دیر تک سکوت کا عالم طاری رہا۔

رات کی عبادت کا وقت ہو چلا تھا۔

'حاضرین! ایک شخص جو خود چل کر ہمارے پاس آیا ہے، اگر ہم اس کا خیر مقدم نہیں کریں گے تو ہم گنہگار ہوں گے۔ کل وہ ہمارا دامن گیر ہوگا۔ وہ ہم سے سوال کرے گا اور ہم اپنے معبود کے سامنے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ کیا اس عدالت میں اس کے سوالوں کا کوئی جواب ہوگا ہمارے پاس؟' اس عمر دراز شخص نے بولتے ہوئے اپنے بدن میں لرزش سی محسوس کی۔

لوگ خاموش تھے اور غور و فکر میں مبتلا تھے۔

'ویسے بھی اس گاؤں میں ہم لوگ تعداد کے اعتبار سے کافی کم ہیں۔ ہماری تعداد کچھ تو بڑھے گی۔ ہم کچھ تو مستحکم ہوں گے؟' ایک نئی عمر کے شخص نے ذرا طیش میں آ کر کہا تو یک لخت موجود سبھی کی عقل و فہم کے دروازے گویا وا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں اس کی دلیل سب کو پسند آئی۔ لیکن کچھ لوگوں نے اسے ناپسندیدگی سے بھی دیکھا۔ انہیں اس کی بات گراں گزری تھی۔ نئی عمر کا شخص سٹپٹا گیا۔ اس کو گھور کر دیکھنے والوں میں سے ایک نے، جس کا ان سبھی میں شاید معتبر مقام حاصل تھا، حتمی طور پر بولا۔ 'ہمیں بہرحال یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ہماری نمایاں اور اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر ہم میں داخل ہو رہا ہے۔'

اس فیصلے پر سبھی کا اجماع ہوا اور سب نے ایک آواز میں کہا۔ 'خوش آمدید... خوش آمدید... مبارکہ... مبارکہ...'

مقام: نو کیلے گنبد والی عبادت گاہ کا چبوترہ

ماحول میں اگر بتی، چندن اور ناریل کے جلنے کی بھینی بھینی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہاں موجود سبھی لوگ یوں تو چپ تھے لیکن ان کے چہرے کی طنابیں کسی ہوئی تھیں۔ بتانے والے نے جو بتایا تھا اس پر یقین کرنا ویسے تو مشکل تھا لیکن یقین نہیں کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقینی اور بے یقینی کے بھنور میں غوطے لگاتا جاننے والے نے پھر تسلی کرنی چاہی۔

'کیا تمھیں پکا یقین ہے کہ وہی تھا؟'

'ہاں میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہی تھا۔'

'آخر وہ ان کے پاس کیوں گیا ہوگا؟'

'ہوسکتا ہے اس دن جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کی وجہ سے۔'

'ارے نہیں، یہ وجہ نہیں ہوسکتی۔ اس کے تو وہ عادی ہو چکے ہیں۔ اس کو اس کی بھول کی جو سزا ملی وہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں؟ وہ بھول کرتے آ رہے ہیں اور انھیں سزا ملتی رہی ہے۔ یہ تو زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔' بولنے والے شخص کی آواز کے پیمانے سے اعتماد چھلک چھلک کر باہر آ رہا تھا۔

'میرے خیال سے وہ ان کے پاس کام مانگنے کی غرض سے گیا ہوگا۔ آخر ایسے لوگوں کو معاش کا مسئلہ بھی تو درپیش ہوتا ہے؟ یا پھر علاج کرانے کے لیے قرض ورض لینے گیا ہوگا؟ ان لوگوں سے انھیں بنا بیاج کا قرض بھی تو مہیا ہوتا ہے۔' ایک شخص نے اپنا جواز پیش کیا۔

'میں سمجھتا ہوں...' ایک شخص ذرا سا رکا پھر بولا۔ 'وہ ان سے اپنا دکھڑا سنانے گیا ہوگا، مدد مانگنے گیا ہوگا؟'

'ارے نہیں۔ ان سے بھلا اسے کیا مدد ملے گی؟ اسے دکھڑا سنانا ہوتا اور مدد لینی ہوتی تو 'لال جھنڈین' کے پاس جاتا۔ جا کر اُن میں شامل ہو جاتا۔' پہلے والے شخص نے اس

کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

'ان کے پاس وہ کیا جائے اور کیوں جائے؟' ایک شخص مضحکہ خیز انداز میں بولا۔' اب ان سے ان کے توقعات وابستہ ہی کہاں رہ گئے ہیں؟ ان کے خواب خواب ہی رہ گئے ۔اب تو ان خوابوں پر گرد و غبار پڑ چکے ہیں۔ جو اندھیرے میں اپنا وجود تلاش کر رہا ہو، اپنے ہونے کا جواز ڈھونڈ رہا ہو، جو خود راستے سے بھٹک گیا ہو، وہ دوسرے کو کیا راستہ دکھائے گا؟ اچھا ہی ہے، ایک دم جینا محال ہو گیا تھا۔'

'لیکن یہ سوال تو اپنی جگہ ہنوز استادہ ہے کہ وہ گول گنبد والوں کے پاس کیوں کر گیا تھا؟' وہاں بیٹھے سب سے بزرگ شخص نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرے۔

'وہ ان میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں اطلاع کے مطابق پورا کا پورا شمالی ٹولہ ان میں شامل ہونے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔' نو وارد شخص کے اس انکشاف سے وہاں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ لوگ مشتعل ہو اُٹھے اور طیش میں کھڑے ہو گئے، کچھ زور زور سے بولنے لگے۔ کچھ وقفہ تک وہاں کا ماحول افراتفری کا شکار رہا پھر معتبر دکھنے والے شخص نے کسی طور سب کو شانت کرایا۔

سکوت ایسا کہ سوئی بھی گرے تو کان کے پردے پھٹ جائیں۔ سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ سبھی کے چہرے پر ایک ہی سوال پتا ہوا تھا۔

'سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر اس نے ان میں ایسی کیا خاص بات دیکھی جو اُن میں شامل ہونے چلا گیا؟ کیا اسے علم نہیں کہ ہم سے بہتر کوئی نہیں۔ ہم سب سے پرانے ہیں۔ ہماری ریتی رواج دنیا کی سب سے پرانی ریتی رواج ہے۔ ہمارے یہاں ہر کسی کے لیے اور ہر کام کا ایک منظّم طریقہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے زندگی گزارنے اور اپنی دوسری دنیا کو سنوارنے کے لیے جو آئین بنائے ہیں اس کے مطابق ہر کسی کی حیثیت، اس کا مقام اور

اس کے کام مقرر کر دیے گئے ہیں۔ کسی کے معاملے میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ دنیا کی سب سے قدیم تہذیب اور سب سے بہتر نظام زندگی ہے۔ اتنے بہتر نظام کو چھوڑ کر وہ کس گڈھے میں گرنے جا رہا ہے۔ کیا اس کی عقل و دانش پر پردہ پڑ گیا ہے؟ ہمارا متبادل کوئی ہے کیا؟' ایک بزرگ شخص نے درمیان میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

'میں تو کہتا ہوں، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ ہم لوگوں کو صرف نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے کسی قدر یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم سے بہتر بھی کوئی ہے اور اس کی جب کبھی بھی خواہش ہو گی وہ ہمیں ٹھینگا دکھا سکتا ہے۔' ایک شخص نے اپنی کھیج نکالی۔

'آپ لوگ خواہ مخواہ اس پر اپنی ناراضگی ظاہر کر رہے ہیں۔ مسئلے کی اصل جڑ تو کہیں اور ہے۔ ہمارے لوگ تو بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اسے ضرور گمراہ کیا گیا ہے۔ اسے ہمارے خلاف بدظن کیا گیا ہے۔' ایک نئی عمر کے شخص نے اپنی بات رکھی۔ ایک دوسرے شخص نے اس کی تائید کی۔

'بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آرہا ہے کہ اسے ضرور کسی نہ کسی طرح کی لالچ دی گئی ہوگی۔ یہ بڑے عیار قسم لوگ ہیں۔ ان کی ہر کوشش میں یہی مقصد پنہاں ہوتا ہے کہ... ایک دن پوری سرزمیں پر ان کا ہی پرچم لہرائے، پوری دنیا پر ان کی ہی حکومت ہو۔'

'ہاں، ہاں۔ ایسا ہی ہے... ایسا ہی ہے۔' تقریباً سبھی نے بولنے والے سے اتفاق کیا اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرانے لگے۔

مقام: گاؤں کا فٹ بال میدان

بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ میدان کے کنارے قطاروں میں گل مہر کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ایک گل مہر کے نیچے دری بچھی ہوئی تھی اور فریقین آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کشیدگی دونوں اطراف حائل تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک جانب

سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

'ہم لوگ اتنے دنوں سے ساتھ رہتے آرہے ہیں...'

'ہمیں بھی اس کا پاس ہے...'

'آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا...؟'

'ہم لوگوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا...'

'کیا آپ لوگوں نے اسے گمراہ نہیں کیا...کیا آپ لوگوں نے اسے ہمارے خلاف نہیں بھڑکایا...کیا آپ لوگوں نے اسے لالچ نہیں دی...؟'

'ہم لوگوں نے اسے قطعی گمراہ نہیں کیا...ہم نے اسے قطعی نہیں بھڑکایا...اور ہم نے اسے کوئی لالچ بھی نہیں دی...'

'کیا یہ بھی غلط ہے کہ آپ لوگ اس کے پاس گئے تھے...؟'

'بالکل غلط ہے...وہ خود چل کر ہمارے پاس آیا تھا...'

'ایسا نہیں ہوسکتا...'

'ایسا ہی ہوا ہے...'

'ایسا کیسے ہوسکتا ہے...؟'

'ایسا کیوں نہیں ہوسکتا...؟'

'اس کی تصدیق کون کرے گا...؟'

'اس کی تصدیق وہی کرے گا...'

'اگر وہ انکار کردے تو...؟'

'ہمیں کوئی اعتراض نہیں...'

'اگر وہ انکار نہیں کرے تو...؟'

'تو ہمارا دروازہ کھلا ہے...'

'اس کا فیصلہ آپ کو منظور ہوگا...؟'

'کیا آپ کو منظور ہوگا...؟'

'ہاں ہمیں منظور ہوگا...'

'ہمیں بھی منظور ہوگا...'

طے پایا کہ اگلی نشست میں اسے بلا کر اس کا حل نکالا جائے۔ فٹ بال کا کھیل بھی ختم ہوگیا تھا۔ نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا۔ بچے تالیاں بجا رہے تھے۔

مقام: سیاسی پارٹی کا دفتر

رہنما کے تشریف رکھتے ہی کارکن بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور میٹنگ کی کارروائی شروع ہوگئی۔

'جیسا کہ آپ سبھی کو علم ہے کہ انتخاب سر پر آن پہنچا ہے۔' رہنما نے بات شروع کی۔ 'اور جب سے آپ سب نے مجھے اپنا رہنما منتخب کیا ہے تب سے مخالف پارٹیوں کے درمیان کھلبلی مچی ہوئی ہے اور ان لوگوں نے اپنی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دی ہیں۔ ہمیں بھی کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا ہے اور ہر طرح سے اپنی تیاری مکمل کرنی ہے۔ اگر ہمیں حکومت حاصل کرنی ہے تو اس انتخاب میں ہمیں اپنا دھیان ان علاقوں پر مرکوز کرنا ہوگا جہاں سے ہمیں گذشتہ انتخابات میں یا تو کم ووٹ ملے ہیں یا پھر بالکل صفر ملے ہیں۔ ایسے علاقوں کے لیے ہمیں کچھ خاص منصوبے تیار کرنے ہوں گے۔'

'ایسے علاقوں میں ہم جلسے جلوس زیادہ منعقد کریں گے اور اشتہار پر زیادہ زور دیں گے...' ایک کارکن نے جوش و ولولوں سے لبریز ہو کر کہا۔

'ان علاقوں میں ہم موجودہ حکومت کی ناکامیوں کو بھی مشتہر کریں گے تاکہ لوگوں کو ہم میں امید کی نئی کرن نظر آئے...' ایک دوسرے کارکن نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

'ان علاقوں میں ہم اپنے ترقیاتی منصوبوں کو بیان کریں گے اور ترقی کی نہر بہا دینے کا وعدہ کریں گے تاکہ برسوں سے زبوں حالی کے شکار وہ لوگ دوسرے کو اپنا مسیحا بنانے کے اپنے سابقہ فیصلے کو مسترد کر دیں...'

ایک کی، دوسرے کی پھر تیسرے کارکن کی بات بھی رہنما نے بغور سنی، ذرا توقف کیا پھر بولنا شروع کیا۔

'دوستو... آپ لوگ جن حربوں کی بات کر رہے ہیں، اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ جنتا بخوبی سمجھ چکی ہے کہ یہ سب محض سیاسی نعروں کے کچھ بھی نہیں۔ ان کو پتا ہے کہ ان کی ترقی، ان کے مسئلوں سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ جو بھی آتا ہے وہ صرف انہیں چھلنے کے لیے آتا ہے... ایسی حالت میں، جب ترکش کے سارے تیر ناکام ہو جائیں، کیا بچتا ہے؟' رہنما نے گہری نظر کارکنوں پر ڈالی۔ 'تب بچتا ہے اِموشن... جذبات... عقائد... یہ ایک ایسا آزمودہ ہتھیار ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ نشانے پر لگتا ہی لگتا ہے اور اپنے ملک میں تو لوگ اِموشن کے اس قدر غلام ہیں کہ صبح کی اپنی ٹٹی سے بھی ان کا اِموشن جڑا ہوتا ہے۔ یہی کمزور رگ ہے یہاں کے عوام الناس کی۔ اسے پکڑنے کی کوشش کیجئے...' رہنما اپنی بات آگے جاری رکھتا کہ ایک شخص نے آکر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ رہنما کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ابھر آئی، اس نے آگے کہا۔

'جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں ان علاقوں پر اپنا دھیان مرکوز کرنا ہوگا جہاں کے ووٹر مخالف کے زیر اثر ہیں اور انہیں اپنا ووٹ دیتے رہے ہیں۔ جیسے کہ شمن پورہ۔ تاریخ گواہ ہے، آزادی کے بعد سے اب تک ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود وہاں سے ہمیں ایک بھی ووٹ نہیں ملا ہے جب کہ وہاں اکثریت ہمارے لوگوں کی ہی ہے۔' کچھ لمحہ رک کر سانس لینے کے بعد اس نے کہا۔

'...آپ لوگ اپنے پورے جسم کو کان بنا کر میری بات سن لیں، اگر اس بار بھی

وہاں کے لوگ آپ کی طرف نہیں جھکے اور آپ کو اپنا ووٹ نہیں دیا تو سمجھ لیجیے حکومت کرنے کا ہمارا خواب، خواب ہی رہ جائے گا...' کہہ چکنے کے بعد رہنما اپنے کارکنوں کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔

'وہاں تو کامیابی ملنا مشکوک ہے۔ بالکل مشکوک ہے...' کارکنوں کے درمیان سرگوشی جاری ہو گئی تھی۔

'کچھ بھی مشکوک نہیں... کچھ بھی ناممکن نہیں۔ آپ سب میری بات سنیں...' رہنما نے انہیں شانت کرایا، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر سرگوشیوں میں انہیں کچھ سمجھانے لگا۔ اس کی بات جوں جوں پوری ہو رہی تھی، کارکنوں کے چہرے کھلتے جا رہے تھے۔

'اس سے قبل کہ وہاں کا معاملہ رفع دفع ہو جائے آپ...' آخری بات ادھوری بول کر رہنما چپ ہو گیا تھا۔

'آپ اطمینان رکھیں... آپ اطمینان رکھیں...' کارکنوں کا جوش ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ رہنما کچھ لمحوں تک ان کے جوش اور ولولوں کو محسوس کرتا رہا پھر اپنے دو مخصوص کارکنوں کی جانب مخاطب ہو کر بولا۔

'وہاں کے لیے پارٹی نے جو لائحہ عمل تیار کیا ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کو کچھ کہنا تو نہیں ہے؟'

'نہیں، بالکل نہیں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کے وفادار ہیں، ہم آپ کے وفادار ہیں۔' بولتے ہوئے دونوں مخصوص کارکنوں کو محسوس ہوا گویا ان کے جسم کے عقبی حصے میں کوئی زائد عضو نمودار ہو آیا ہے اور تیزی سے ہلنے لگا ہے۔ رہنما کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے تھے۔

مقام: شمن پورہ گاؤں

وہ غائب ہوگیا تھا۔اس کی تلاش شدت کے ساتھ کی جارہی تھی لیکن وہ اپنی بیوی بچے کے ساتھ غائب ہو چکا تھا۔اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور گھر کے اندر اس کے اثاثے جوں کے توں پڑے ہوئے تھے لیکن وہاں اس کی یا اس کی بیوی اور بچے کی موجودگی کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔

گاؤں کی فضا مکدر ہوگئی تھی۔ ماحول میں افواہ، شک وشبہات، غصہ، نفرت کسی وبائی مرض کی طرح پھیلنے لگی تھی۔

'بھاگ گیا سا...لا...'

ایک جماعت کا خیال تھا۔

'ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا'

دوسری جماعت کا خیال تھا۔

'بھاگ گیا یا بھگا دیا گیا؟' دونوں جماعتیں سوچ رہی تھیں۔

'ضرور اُن لوگوں نے اسے بھگا دیا ہے؟' ایک جماعت نے نتیجہ اخذ کیا۔

'ضرور انھوں نے ہی اسے خوف زدہ کر کے بھگایا ہے...' دوسری جماعت نے بھی فیصلہ کن طریقے سے سوچا۔

دونوں جماعتوں میں غلط فہمی بھی خوش فہمی بھی۔ دونوں جماعتیں اسے اپنی اپنی میراث سمجھ رہی تھیں اور اس کو لے کر دونوں جماعتوں کے مابین صف آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

'آپ لوگوں کو اس کی قیمت چکانی ہوگی...'

'آپ لوگوں کو بھی اس کی قیمت چکانی ہوگی...'

'ہم دکھا دیں گے...'

'ہم بھی دکھادیں گے...'

وہ رات دونوں جماعتوں نے رتجگا کر کے گزاری۔

صبح صبح سب کی ناک تیز خوشبو سے پھڑکنے لگی۔ گاؤں کی گلی گلی خوشبو سے معطر ہو اٹھی۔ اس نے عطر کی پوری شیشی شاید بدن پر انڈیل رکھی تھی۔ چارخانے کی لنگی، سفید کرتا اور کندھے پر چارخانے کا ہی ہرے رنگ کا صافہ۔ آنکھوں میں گہرا سرمہ لگائے وہ جدھر سے گزر رہا تھا سب کی آنکھیں برساتی ندی کی طرح چوڑی ہوئی جارہی تھیں۔

وہ لوٹ آیا تھا۔

پورا دن گرم اور اجنبی ہوائیں گاؤں کا محاصرہ کرتی رہیں۔ رات ہوئی تو شعلہ بار ہوائیں اٹھیں۔ مکانات دھودھو کر جلنے لگے۔ چیخ و پکار، کہرام...نوحہ...بین....

نقصان دونوں طرف ہوا۔ لوگ دونوں طرف کے مارے گئے۔ وہ اور اس کی بیوی بچے بھی مارے گئے۔ لیکن ان کا مارا جانا کس کا نقصان تھا، نقصان تھا بھی یا نہیں، اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہ تھا۔

مقام: گاؤں کا قبرستان

جو زندہ بچ گئے تھے وہ مرنے والوں کو دفنا رہے تھے۔ بچوں کو... بوڑھوں کو... عورت اور مردوں کو...ایک ایک کر سارے جنازے دفنائے جاتے رہے۔ اس کا اور اس کی بیوی بچے کا جنازہ بھی اپنے دفنائے جانے کا منتظر رہا۔ وقت گزرتا رہا، گزرتا رہا، کافی گزر گیا۔ ان کے جنازے پڑے رہے۔

مسئلہ درپیش تھا...

'ان کے جنازے ہمارے قبرستان میں کیسے دفنائے جاسکتے ہیں...؟'

'کیوں، اب تو وہ ہماری جماعت کا حصہ تھے...'

'ہاں...لیکن انھوں نے تبدل اختیار کیا تھا...'

'ہم لوگوں نے بھی تو تبدل ہی اختیار کیا ہے...'

'ہماری بات کچھ اور ہے...ہم لوگ وہاں ناف سے اوپر والے تھے اور یہ.... اس لیے....'

جنازوں کے اپنے دفنائے جانے کا انتظار طویل سے طویل ہوتا گیا یہاں تک کہ ان میں تعفن پیدا ہونے لگا۔

مقام: عالم ارواح

وہ، اس کی بیوی اور اس کی بیٹا ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہیں۔

وہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر مسکرایا۔ بیٹا سمجھ نہ سکا، ماجرا کیا ہے۔ اس کا باپ کیوں مسکرا رہا ہے۔ وہ اس کا مسکرانے کا سبب جاننا چاہتا تھا۔

وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اس کی مسکراہٹ کی وجہ سے تذبذب میں مبتلا ہے۔

عفونت سے اس کی ناک بجبجا اٹھی۔

'میرے پاس تمہارے لیے ایک امانت ہے...'

اس نے پشتینی امانت اپنے بیٹے کو سونپ دی۔

OO

۔ ادب سلسلہ، شمارہ ۱، ۲۰۱۶، نئی دہلی

آخری لائن

صغیر رحمانی

آخری لائن

کہانی کی آخری لائن...

جیسے ہی پوری ہوئی کربِ تخلیقیت سے نجات مل گئی۔ایک ہفتے سے جو بے چینی، جو چھٹپٹاہٹ تھی، وہ راحت میں بدل گئی۔ایسا احساس جیسے سمندر کی اچھلتی ہوئی لہریں شانت پڑ گئی ہوں۔شانت پرسکون اور مطمئن۔ہر تخلیق کار کی اپنی تخلیقی روش ہوتی ہے۔کوئی ایک نشست میں کہانی لکھتا ہے، کوئی ہفتوں مہینوں لگا دیتا ہے۔کسی کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔کوئی ایک مقررہ وقت میں لکھنے بیٹھتا ہے۔کوئی رات میں لکھنا پسند کرتا ہے تو کوئی دن میں لیکن ان مختلف طرز تحریر کے باوجود ایک چیز سب میں مشترک ہوتی ہے۔کہانی کا ساتھ...ان تمام مراحل میں کہانی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔کہانی کار اسی کے ساتھ سوتا ہے اور اسی کے ساتھ جگتا ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

کہانی شروع ہوئی تو پوری ہونے تک وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔کھانا پینا، پیشاب، پیخانہ، سونا جگنا، یہاں تک کہ ہم بستری بھی اسی کے ساتھ۔گھر میں سب کے موجود ہوتے سب سے الگ تھلگ، سارے ماحول سے کٹا۔گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہونا چاہیے؟ کون آیا، کون گیا؟ سارے تعلق قطع۔فون بند، گھر والوں سے بات چیت بند۔بیوی سے، بیٹی سے، پورے دن رات ملا کر شاید دو چار لفظوں کا لین دین۔ان کے پاس ہوتے ہوئے ان کے پاس نہیں۔وہ پوچھیں کچھ، جواب ملے کچھ۔وہ بھی ہوں ہاں میں۔عموماً بستر پر لیٹ کر لکھتا ہوں۔سینے کے نیچے تکیہ لگا کر۔لکھنے کا کوئی وقت نہیں۔رات کے دو بجے

ہوں، صبح کے پانچ بجے ہوں یا دوپہر کے بارہ۔ کہانی نے جب پکارا، لکھنے لگے۔ ہر وقت آنکھوں میں جیسے فلم چلتی رہتی۔ کردار... حالات... موضوع... زبان... کرافٹ... الجھن... کرب... اضطراب... اور جب کہانی کی آخری لائن لکھی جاتی تو محسوس ہوتا کہ... کہ... اُف... معاف کریں، ممکن نہیں ہے اس کو بیان کرنا۔ مطمئن چہرہ اور آسودہ آنکھیں دیکھ کر ہی بیوی، بیٹی، سمجھ جاتی ہیں کہ اب میں نارمل ہوں۔ کہانی کی آخری لائن لکھنے کے بعد قدرے ہیجان میں قلم کو گھسیٹتے ہوئے میں نے بے پناہ سکون کا احساس کیا۔ شاید یا پھر یقینی طور پر قلم کا یہ گھسیٹنا کسی بھی ادیب کے لیے سب سے پر مسرت لمحہ ہوتا ہوگا۔ ایک ہفتہ تک ایک دوسری دنیا میں رہنے کے بعد جب میں واپس پرانی دنیا میں آیا تو یقین کریں، سب کچھ نیا نیا لگ رہا ہے، جیسے ایک خوش نما خواب سے باہر آیا ہوں۔ جیسے ایک لمبے سفر سے واپس لوٹا ہوں۔ بیوی اور بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہیں اور اب میں ان سے پوچھتا ہوں شام کے لیے سبزی کیا لانا ہے اور یہ کہ گیس ختم ہوگئی ہے کیا؟

کہانی پوری ہوگئی ہے اور میں خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اس کہانی نے لکھتے وقت کئی بار مجھے جذباتی کیا، کئی بار مجھے بوجھل بنایا۔ ایک دو بار جیسے آنکھیں گیلی گیلی سی ہوگئیں۔ دراصل کہانی... نہیں، کہانی جس وقت جنم لے رہی ہو اُس گھڑی سے گزرنا ہی کچھ ایسا ہے کہ... بازار انسان کو کتنا بے حس بنا سکتا ہے۔ اس کی انتہا ہے اس کہانی میں۔ بازار کا سب سے بڑا حاصل یہ ہے کہ اس نے جوڑا کچھ نہیں۔ صرف الگ کیا ہے۔ اس نے رشتوں سے رشتوں کی حدّت کو الگ کیا ہے، اعتماد سے اعتماد کی استقامت کو چھینا ہے، پریم سے پریم کی کشش کو الگ کیا ہے۔ آج انسان ہے، انسانیت نہیں، گھر ہے، گرہستی نہیں۔ معاشرہ ہے، معاشرت نہیں، اس نے سب کو پیداوار میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ زندگی... موت... آنسو... مسکراہٹ... خواب... خواہش... تعلق... سب کچھ پیداوار کی شکل میں آج بازار میں مہیا ہے۔ آج کا انسان صبح سے شام تک بازار سے بازار میں سفر کر رہا ہے اور اس

کی پاداش میں حس کی بھاری قیمت چکا رہا ہے۔

اس بڑے اور نازک کینواس سے گزرتی اس کہانی نے پوری ہوتے ہوتے مجھے جانے کتنی بار بے چین اور جذباتی کیا۔قاری اس کو کس طور پر لے گا میں نہیں جانتا لیکن میں اس کو اپنی ایک اچھی کہانی کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔اب اس پر کچھ دوستوں کا ردعمل مل جائے تو کہانی مزید ترش جائے۔ میری عادت ہے کہ کہانی پوری کرنے کے بعد ادبی دوستوں کو یا ادبی نشستوں میں ضرور سناتا ہوں تا کہ کہانی کی نوک پلک سنور جائیں اور بچی کھچی کسر پوری ہو جائے۔ ایسی حالت میں کہانی کار دوست کمار آنند کا چہرہ آنکھوں میں گھومتا ہے۔ یہ آدمی اچھی کہانی لکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی کہانیوں پر اچھا ایمان دار ردّ عمل بھی دیتا ہے۔میری اکثر کہانیوں کا پہلا سامع یہی شخص ہوتا ہے۔

کمار آنند سرکاری دفتر میں کام کرتے ہیں اور دو بجے کے بعد عام طور پر یاروں کے لیے مہیا رہتے ہیں۔کہانی لکھنے کی بے قراری تو ختم ہو گئی لیکن اب آنند جی کو سنانے کی بے قراری بڑھ گئی ہے۔ادیبوں کو ہونے والی کئی بے چینیوں میں سے یہ ایک ہے۔ پہلے لکھنے کی بے چینی، پھر کسی رسالے میں شایع ہونے کی بے چینی اور اس کے بعد قاری کے ردّعمل کی بے چینی...

جلدی جلدی تیار ہو کر میں نے سکوٹر نکالا۔ کئی روز سے چلا نہیں ہے، ٹھنڈا پڑا ہے۔سٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔غصّہ اتنا آیا کہ دو چار لات مارنے کی خواہش ہوئی۔ لگاتار کک مارے جا رہا ہوں۔بیوی دروازہ پر آتی ہے۔

'اے جی...اے جی...نن سٹیک پین لے لیجئے گا...دیوالی پر چھوٹ بھی ملے گی...'

ایک تو سکوٹر سٹارٹ نہیں ہو رہا...اوپر سے...میں نے بیوی کو کس نظر سے دیکھا، بیان نہیں کر سکتا۔

'لیکن گھر میں پین تو ہے...؟'

’ہے... پرنن سٹیک نہیں ہے... وہی والا لیجئے گا جس کا اشتہار ٹی وی پر آتا ہے۔‘
کیسے کیسے سکوٹر سٹارٹ ہوا اور میں آنند جی کو کہانی سنانے چل پڑا۔
دفتر میں کمار آنند اپنی ٹیبل پر نہیں ہیں۔ ارے یار، مہان کہانی کار، کہاں ہو؟ ہر وقت اپنی ٹیبل پر موجود رہنے والے آج ہی تجھے اپنا رکارڈ توڑنا تھا؟
ان کے ساتھ کام کرنے والے، جن سے آتے جاتے میرا بھی تعارف ہو گیا ہے، ابھی ابھی لنچ سے فارغ ہوئے لگتے ہیں۔ ریلیکس لگ رہے ہیں۔ پتا چلا کہ آنند جی کسی میٹنگ میں ہیں۔ ایک گھنٹا بعد مل سکیں گے۔ جوش اور ولولے کا پھین جو گجگجایا ہوا تھا ایک گھنٹا کا نام سن کر بلبلے سا بیٹھ گیا۔ میں بھی بیٹھ گیا ہوں سامنے کرسی پر۔ کوئی چارہ نہیں ہے۔ آنند جی کے ساتھ کام کرنے والوں میں جوش ہے۔ چہرہ کھلا کھلا لگ رہا ہے۔ وجہہ معلوم ہوئی... چھٹے پے کمیشن کی سفارشیں لاگو ہو گئی ہیں۔ تنخواہ میں ہر ماہ کم سے کم چار سے پانچ ہزار کا اضافہ ہو گا۔ ساتھ ہی ایریئر کے طور پر ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہوں گے، سوا لگ۔ اس کے حساب سے ان کے منصوبے بھی بن رہے ہیں۔ ایک صاحب اس اچانک وارد ہوئی آمدنی سے لکھ ٹکیا کار لیں گے۔ ابھی ان کے پاس بائیک ہے۔ ایک صاحب ایل سی ڈی لیں گے تاکہ وہ اور ان کے گھر والے گھر میں ہی سنیما حال کا لطف اٹھا سکیں۔ ایک صاحب ان پیسوں کو شیئر مارکٹ میں لگائیں گے کہ اس وقت شیئر کے بھاؤ گرے ہوئے ہیں اور اس وقت اس میں پیسہ لگانا مستقبل میں کافی نفع بخش ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب اسے سونا میں لگانے کا پورا ارادہ کر چکے ہیں کہ سونا کی چمک بڑھتی جا رہی ہے، بڑھتی ہی جا رہی ہے۔
یہ سارے لوگ اپنے اپنے زاویے سے کسی اکسپرٹ کی مانند تمام حالات کا تجزیہ بھی پیش کر رہے ہیں۔
دنیا پر مسلط معاشی بحران، کمپنیوں، معاشی اداروں کا دیوالیہ پن، ریزرو بنک کا

کچھ ہی دنوں میں کئی بار سی آر آر گھٹانا، حکومت کی طرف سے بازار کو قابو میں کرنے کے لیے اٹھائے گئے سخت قدم اور تیسری دنیا کے ایک ترقی پزیر ملک کے وزیرِ اقتصادیات کا بیان...'ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...، خواہ اپوزیشن کے پاس کسانوں کی خودکشی کا مدّعا ہے، مڈل کلاس پر مہنگائی کا بوجھ ہے۔ باوجود اس کے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتنا اطمینان دلاتا ہے یہ بیان...'ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

آنند جی کے انتظار میں میں پہلو پر پہلو بدل رہا ہوں اور جوش سے بھری ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ ان کی پر جوش اچھلتی کودتی باتوں میں رخنہ در پیش آیا ہے۔

کوئی آیا ہے۔

'کیا بات ہے...؟' ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا۔

'بابو جی...مجبور آدمی ہوں۔ میرا بیٹا اسپتال میں بھرتی ہے...دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں بابو جی...آپ لوگوں سے مدد مانگنے آیا ہوں...بہت مجبور آدمی ہوں بابو جی...'

'ارے یار، ہٹّے کٹّے ہو...کام کیوں نہیں کرتے....اس طرح مانگتے پھر رہے ہو....تم کو شرم نہیں آرہی....؟' دوسرے صاحب نے کہا۔

'گاؤں میں مجوری کرتا ہوں بابو جی.....ستّر روپے کماتا ہوں دن کے...میرا بیٹا کئی دنوں سے اسپتال میں بھرتی ہے....اسے جانڈس ہو گیا ہے......شریر کا خون پانی بن گیا ہے..گھر سے جو پیسے لے کر آیا تھا۔ سب ختم ہو گئے.....اب یہاں مجھے کون کام دے گا بابو جی.....دوائی کے لیے ایک پیسہ نہیں ہے.....آپ لوگ مدد کیجیے بابو جی......بہت مجبور آدمی ہوں...' وہ تقریباً گڑگڑا رہا ہے۔

'ارے یار، سرکاری اسپتال میں تو آجکل دوا مفت میں ملتی ہے...تمہیں پیسے کی کیا ضرورت ہے...' تیسرے صاحب نے فکر کا اظہار کیا۔

'صرف نام کا سرکاری اسپتال ہے بابو جی....ساری دوائی باہر دکان سے خریدنی پڑ

رہی ہے....ڈاکٹر بابو بولتے ہیں تمہیں اسپتال میں پھری میں دیکھتے ہیں، یہ کیا کم ہے...
بابو جی آپ لوگ میری مدد کیجئے....میرا بیٹا مر جائے گا....' بولتے بولتے اس کا گلا بھر آیا ہے
اور آنکھیں چھل چھلا آئی ہیں۔

'ارے سنو سنو...آخر اسے جانڈس کیسے ہوا...؟' چوتھے صاحب نے جیسے دور کی
کوڑی پیش کی۔'اس کا مطلب ہے کہ وہ زبان کا تیز ہے، چٹورا ہے...چٹپٹی چیزیں کھانے کا
عادی ہے...اسے اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا ہوگا...ہر کوئی جانتا ہے کہ تیل مسالہ والی چیزیں
نقصان دہ ہوتی ہیں۔اس سے جانڈس ہو سکتا ہے....پھر یہ بات اسے کیسے معلوم نہیں
ہوگی....وہ یہ بھی جانتا ہی ہوگا کہ جانڈس ہو گیا تو علاج کیسے ہوگا...؟ یہ ساری باتیں تو وہ
جانتا ہی ہوگا....پھر بھی وہ اپنی عادت سے باز نہیں آیا...اب یہ تو بھئی اس کی غلطی ہے....'

'...اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ...' پہلے والے صاحب نے درمیان میں بات لپک
لی...'کہ وہ دارو شراب کا رسیا ہو....خوب چھک کر پیتا ہوگا....آخر لیور خراب ہونے سے ہی تو
ہوتا ہے جانڈس....بھئی، یہ سراسر اس کی غلطی ہے....اس میں ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں...؟'

'ہاں بھئی....ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں....؟' سبھی نے تقریباً ایک لہجہ میں کہا۔

'ارے بھئی سنیے....یہ آپ لوگوں کا بھاشن سننے یا پاٹھ پڑھنے نہیں آیا ہے...آپ
سے مدد مانگ رہا ہے....کچھ دینا ہو تو دیجیے....نہیں تو آگے بڑھائیے....' ان میں سے
ایک صاحب نے بات ختم کرنی چاہی۔

'ارے تو آپ ہی دیجئے نا.....آپ تو بڑے مددگار ہیں'...ایک صاحب نے
قدرے طیش میں آکر کہا۔

'ٹھیک ہے....سنو بھائی....تم ایک کام کرو.... پانچ بجے تم اسپتال کے پاس
رہنا....میں آفس سے چھوٹ کر وہاں آؤں گا....اور تمہاری دوا کا انتظام کر دوں گا.....بھولنا
نہیں، تم وہیں رہنا...اب تم جاؤ....'

وہ شخص مایوس ہو کر جا رہا ہے۔ میرے پاس کچھ پیسے تو ہیں، لیکن آپ نے سنا نہیں، آتے وقت بیوی نے کیا کہا؟ آج بھی اگر اس کا نن سٹک پین نہیں لے گیا تو سمجھئے مہابھارت رکھا ہوا ہے۔ پورا گھر اشانت ہو جائے گا۔ لکھنے پڑھنے والوں کے لیے سکون ضروری ہے۔ اس شخص کے جانے کے بعد ان لوگوں کی بات چیت دوبارہ جاری ہو گئی ہے۔ لیکن موضوع بدلا ہوا ہے۔

'آجکل اس طرح کا فراڈزم اتنا بڑھ گیا ہے کہ مت پوچھیے۔ ایک بار میں ٹرین پکڑنے جا رہا تھا۔ ایک آدمی میرے پاس آیا۔ بولا، اس کی جیب کٹ گئی ہے۔ کرایہ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ سسرال والوں نے اس کی بیٹی کو جلا دیا ہے۔ اسے وہاں جانا ہے۔ اس طرح وہ مجھ سے بیس روپے لے گیا۔ کچھ دنوں بعد پھر میں نے اسی آدمی کو اسٹیشن پر اسی طرح ایک دوسرے آدمی سے مانگتے ہوئے دیکھا۔ دیکھ کر تو میں دنگ ہی رہ گیا۔'

'ارے اتنا ہی...' ایک صاحب کی بات ختم ہوئی تو دوسرے صاحب نے کہنا شروع کیا۔ 'میں آپ لوگوں کو ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ایک بار ٹرین میں ایک اندھا بھکاری بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا... تمہیں تو دکھتا ہے جی.... ٹرین رکی تو اتر کر وہ کھڑکی کی جانب سے میرے پاس آیا اور غصّے میں بپھرتے ہوئے بولا۔ 'آپ کو نہیں دینا ہے تو مت دیجئے.... دوسروں کو کاہے بھڑ کاتے ہیں.... کہہ دیتے ہیں، اچھا نہیں ہوگا...' بعد میں پتا چلا اس کے دو دو ٹرک اور کئی چھوٹی گاڑیاں چلتی ہیں اور اس نے باضابطہ کئی اسٹاف رکھے ہوئے ہیں۔'

'ارے یہ تو کچھ بھی نہیں... میں جو بتا رہا ہوں، وہ سنیے...' دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے تیسرے صاحب نے شروع کیا۔ 'ایک بار میں بنارس گیا تھا۔ گھاٹ پر جانے والے راستے میں ارتھی پر ایک لاوارث لاش پڑی ہوئی تھی۔ لوگ روپے پیسے ڈالتے جا رہے تھے۔ میں بھی کچھ ریزگاری ڈالتا ہوا آگے نکل گیا۔ اتفاق سے مجھے

جلدی لوٹنا پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں، وہ لاش اٹھ کر روپے پیسوں کو اکٹھا کر رہی ہے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ پوچھ بیٹھا،تم تو مرے ہوئے تھے؟

جانتے ہیں، بڑی بے شرمی سے ہنستے ہوئے کیا بولا۔ جینے کے لیے مرنا پڑتا ہے بابو جی....'

چوتھے صاحب کے پاس اس طرح کا شاید کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تینوں واقعات کو سننے کے بعد اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔' دیکھا جائے تو سچ مچ بھٹ جگ آ گیا ہے۔ انسانیت نام کی چیز کسی کے پاس رہ ہی نہیں گئی ہے....'وہ صاحب اور بھی نہ جانے کیا کیا بول رہے ہیں لیکن میرا ذہن ان کی طرف سے ہٹ گیا ہے۔ کمار آنند آ گئے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی میں مسرور ہو اٹھا ہوں۔ اتنی دیر کے انتظار کی شکایت بھی جڑ دی ہے میں نے۔ وہ بے چارے معصوم مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے ہیں۔

'لگتا ہے کوئی نئی کہانی ہوگئی ہے؟'بوتل سے پانی پینے کے بعد وہ کہتے ہیں۔

'بس آپ جلدی سے سن لیجئے اور اس کا عنوان سجھا دیجئے...'میری بے قراری دیکھ کر ان کی مسکان مزید پاکیزہ ہو اٹھی ہے۔ ان کی اجازت، حکم کسی چیز کی پروا کیے بنا میں نے ڈائری کھول لی ہے اور انہیں کہانی سنانے لگا ہوں۔ میں انہیں سنا رہا ہوں۔ وہ توجہ اور پورے انہماک سے سن رہے ہیں۔ جیسا کہ لکھتے وقت میں جذباتی ہوا تھا، سناتے ہوئے بھی میری آواز بھر آ رہی ہے لیکن میں نے پوری کہانی انہیں سنا دی۔ کہانی سننے کے بعد وہ کہیں کھو سے گئے ہیں۔ ایک دم چپ ہیں۔ میں انہیں ٹوکتا ہوں۔

'کچھ کہیے...'

'صرف اتنا کہ... مجھے آپ سے حسد ہو رہی ہے۔'

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ احمق کی طرح ان کا منہ تک رہا ہوں۔

'ارے یار، ایسی کہانی آج تک میں نے کیوں نہیں لکھی....اتنا حساس.....اتنا

ضرب کاری..ایسی زبان...ایسا کرافٹ اور ایسی عکاسی شاید ہی میں نے کسی کہانی میں دیکھی ہو.... یہ کہانی تو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی اور جزئیات نگاری کا تو جواب نہیں۔ آپ دیکھئے گا، اس پر اتنا چرچا ہوگا کہ شاید ہی کسی کہانی پر ہوا ہو اور دیکھیے گا، یہ کہانی سالوں سال تک یاد رکھی جائے گی...'

'اور موضوع....؟'

'موضوع....؟ ارے اس کا کیا کہنا۔ آپ تو مجبوروں، غریبوں، بے بسوں کے حق میں لکھنے والوں کے طور پر جانے ہی جاتے ہیں۔ مجبوروں، بے سہاروں کے لیے تو آپ کی تحریر ہتھیار کے طور پر کام کرتی ہے۔ ان کے لیے جو درد، تڑپ آپ کے یہاں ملتی ہے، وہ کسی اور کے یہاں کہاں؟ اس میں نیا پن یہ ہے کہ آپ بازار میں انسانیت ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ آپ کو کہیں مل نہیں رہی ہے۔ مل بھی رہی ہے تو برانڈ کی شکل میں۔ دوسرا نیا پن یہ ہے کہ جو بازار ہے وہ احساس کی قیمت پر اپنے برانڈ بیچ رہا ہے۔ واہ واہ، کیا بات ہے۔ کتنا اندر اترے ہیں آپ؟ اتنی گہرائی میں تو بس آپ ہی جا سکتے ہیں...'

مجھے لگ رہا ہے، جیسے مجھے سند مل گئی ہو۔ کمار آنند جن کی کہانی پر اتنی باریک پکڑ ہے'ان کے یہ کمپلی منٹس میرے لیے کسی سند سے کم نہیں۔

'اب اس کا عنوان بھی بتا دیجئے...'

'اس کا عنوان رکھیے...آخری لائن...'

میں بے قابو ہو رہا ہوں۔ خوشی کی وجہ سے میری رگوں کے اندر خون کی رفتار بڑھ گئی ہے۔ آنند جی نے کہانی کو جس زاویہ سے سمجھا ہے، بس وہی ہے میرا اپروچ۔ اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ آپ جو کہنا چاہ رہے ہیں، سامنے والے تک اسی طرح تفہیم ہو جائے۔ آجکل اکثر یہ ہو رہا ہے کہ آپ کہہ رہے ہیں کچھ اور سمجھنے والا سمجھ رہا ہے کچھ۔ کمی خواہ جس میں ہو لیکن تخلیق کار کو جس کرب سے دو چار ہونا پڑتا ہے، وہ برداشت

سے باہر ہوتا ہے۔

کمار آنند کو شکریہ کہہ کر میں اپنے اسکوٹر پر اڑا جا رہا ہوں جیسے میری دونوں جانب پنکھ لگ گئے ہوں۔ اس سے بھی زیادہ تیز ہے میرے من کی اڑان۔ وہ اڑا جا رہا ہے، اڑا ہی جا رہا ہے۔ اسپتال کے پاس سے گزرتے وقت اچانک میرا پیر بریک پر پڑ گیا ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ اسپتال کے گیٹ پر وہی شخص، جو آنند جی کے دفتر میں آیا تھا، لوگوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کچھ کہہ رہا ہے۔ میں غور سے سننے لگتا ہوں۔

'میرا بیٹا مر گیا ہے.... اس کی مٹی منزل کے لیے مدد کیجئے.... بہت مجبور آدمی ہوں بابو جی... مدد کیجئے...'

سڑک کنارے اس کے بیٹے کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھتا ہے، پھر رک جاتا ہے۔

نن سٹیک پین...

اور میں بریک سے پیر ہٹا لیتا ہوں۔

OO

۔مژگاں، کولکاتا، شمارہ ۴۱۔۴۲، ۲۰۱۵

۔جن پتھ (ہندی)

بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں

صغیر رحمانی

بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں

'شرما وِلا' میں رہنے والے ایک ایک فرد کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

اے پی شرما ملازمت سے سبک دوش ہو چکے انردھ پرساد شرما شام پانچ بجے اِوننگ واک کے لیے گھر سے نکلے تھے اور ابھی رات کے دس بجے تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ دو بیٹوں بڑے اور چھوٹے، دو بہوؤں بڑی اور چھوٹی اور سونو نام کے ایک پوتا والے اے پی شرما کا یوں تو یہ ان کی اپنی خاص طرز زندگی کا ایک حصہ تھا لیکن تشویش والی بات یہ تھی کہ اس ہاڑ کپا دینے والی سردی میں اے پی شرما یعنی کہ ڈیڈا اپنا اوورکوٹ اور ہیٹ ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ اس کے بنا انہیں سردی لگ جائے گی، سانس کی پریشانی بڑھ جائے گی اور 'شرما وِلا' کی اینٹیں ہل جائیں گی۔

بڑے، دو بار احمد بھائی کی چائے دکان کا چکّر لگا آیا تھا۔ اکثر بیٹھا کرتے ہیں وہاں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کا اڈّا ہے۔ خوب چھنتی ہے ان کے ساتھ بڑھؤ کی۔ کتنی بار منع کیا ہے، مت بیٹھا کریں وہاں... کیسے بیٹھ لیتے ہیں، ماں کا لونڑا... بین کا لونڑا کرنے والوں کے ساتھ... پر کہاں ماننے والے۔ بس ایک ہی جواب، دخل مت دیا کرو میرے معاملوں میں... ٹھیک ہے بھئی، نہیں دیتے دخل... کرو جو جی میں آئے...

لیکن آج تو وہاں بھی نہیں تھے۔ چھوٹے نے ان کے سبھی ملنے والوں، جو انگلیوں کی گنتی بھر تھے، کو فون لگا کر پوچھ لیا تھا۔ کہیں نہیں تھے، کسی کے پاس نہیں تھے۔

ٹی وی پر موسم کا حال بتانے والی اس لڑکی نے جو، جیسے ناک سے بولا کرتی تھی، جو بالکل پسند نہیں آتی تھی ڈیڈ کو، ان کے مطابق 'ممیاتے' ہوئے بتایا تھا، ٹمپریچر پانچ ڈگری۔

کہنے پر یقین ہی نہیں کریں گے۔ نہیں کریں گے کہ انہیں اس کا 'ممیانا' پسند نہیں۔ ار...رے ...کسی کی ممیانے جیسی آواز کیول ہونے سے حقیقت تھوڑے بدل جائے گی۔ درجۂ حرارت پانچ ڈگری ہے تو وہ پانچ ڈگری بتائے گی۔ اس کی آواز سے کیا لینا دینا؟ لینا دینا تو پانچ ڈگری کے ٹیمپریچر سے ہے۔ اب اُسے وہ ممیا کر بتائے یا ہنہنا کر بتائے۔ پچھلے پانچ سالوں کا ریکارڈ ٹوٹا ہے۔ ایسا کہرا اور سردی کہ گلی کے کتے کتیاں بھی دبکے پڑے ہیں کونے کھدروں میں۔ بھئی کیا کریں... دبکیں نہیں تو... کچھ ہو ہوا گیا تو انہیں کون لے جانے والا ڈاکٹر حکیم کے پاس۔ یہاں تو یہ ہے کہ... ہم ہیں پڑے... ایک ایک فرد... ایک ایک پیر پر کھڑا... یہ ڈاکٹر، وہ ڈاکٹر کرنے والا... سانس کے مریض کے لیے ٹھنڈک، دھول، دھواں تو ویسے بھی زہر ہے، لیکن کون سمجھائے... سمجھایا تو سونو کو جاتا ہے... بچّے کو... ناتی، پوتا والے کو سمجھانا، کیا خود کو بے وقوف بنانے جیسا نہیں ہے اور اگر کوئی سمجھانے کی جرأت کر بھی لے تو چھلاّ بنا کر سگریٹ کا دھواں ایسے اس کے منہ پر اگلیں گے جیسے... کرلو، جو کرنا ہے....

بڑھئو نے ایکدم سے ناک میں دم کر دیا ہے....

بڑی کئی بار جھانک آئی تھی چینل سے باہر۔ سونو کو بھیجا کئی بار مفلر ٹفلر باندھ کر گلی کے موڑ پر، آنکھیں گڑا کر دیکھنے کے لیے کہرے میں۔ اوپر سے شال بھی لپیٹا۔ چو رہا ہے ٹپ ٹپ۔ جیسے اوس نہیں، پگھلے ہوئے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔

چھوٹی، شام سے ہی جو کھڑکی سے لگی کھڑی تھی، تو ہلی نہیں تھی۔ ابھی پچھلے سال آئی تھی وہ۔ اتنے دنوں میں ہی پہچان گئی تھی ڈیڈ کی آہٹ کو۔ ہر آہٹ پر کان لگائے کھڑی تھی۔

بڑے سے رہا نہیں گیا۔ وِنڈ چیٹر کی ٹوپی باندھتا پھر نکلا بے چین من کو شانت کرنے۔ دل میں اندیشہ... سردیوں میں اینٹھ کر کہیں گرے پڑے نہ ہوں... بڑھاپے کی ہڈیاں... کہاں جھیل پائیں گی ہڈیوں میں چھید کر دینے والی کنکنی... اور من میں کھیج بھی... کیا ضرورت تھی ایسی سردی میں باہر جانے کی... اور وہ بھی بنا گرم کپڑوں کے... سچ، بڑھئو نے

ایکدم سے ...کیا، کوئی اس طرح بھی پریشان کرتا ہے...اور یہ اوس... چہرہ بھیگ رہا ہے، جیسے اوس کی شکل میں پھوہاریں پڑ رہی ہیں۔

روزانہ کا معمول ہے۔ مارننگ واک اور اِوننگ واک۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی بیماریاں ہیں یہ سب۔ ریل میں تھے تو اٹارسی ممبئی کرتے رہے۔ وہ جو چکر کی بندھی پیروں میں تو آج تک بندھی ہے۔ کتنی بار کہا، تھک گئے ہیں...آرام سے رہیے...محلّے کے اور بوڑھوں کو دیکھئے...آرام کر رہے ہیں...ان سے کسی کو پریشانی نہیں ہوتی...شام کو سب پارک میں جمع ہوتے ہیں...لیکن انہیں تو دنیا کے سبھی بوڑھوں سے چڑھ ہے...کیسی حقارت سے کہتے ہیں... بلڈی اولڈ مین... ہاں بھئی، اولڈ مین تو ہیں...آپ بھی تو کوئی جوان نہیں ہو...سانس کے مریض ہیں... پانچ بجے سے جو نکلے ہیں تو اس سردی میں ابھی تک کہاں ہیں، کچھ اتا پتا نہیں ہے...

گلی کا موڑ مڑتے ہی چوراہے کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ گھنگھور کہرے کی وجہ سے زیادہ دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی، بس کچھ دور تک دھواں بھرے پائپ ہول سی لگ رہی تھی۔

چوراہے پر دھند کے پیراہن میں لپٹے ایک ٹھیلے کے پاس ڈیڈ دہی بڑے کھاتے ہوئے نظر آ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر تو بڑے کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔

'ڈیڈ... یہ کیا کر رہے ہیں...؟' بے انتہا سردی اور بے انتہا خفگی...اس کے منہ سے بھک بھک بھاپ کے گولے نکلے۔

'دہی بڑے کھا رہا ہوں...' ڈیڈ پرسکون تھے۔ ٹھیلے والے سے اور مرچی ڈلوا رہے تھے۔

'اس موسم میں...؟' وہ اندر سے تقریباً اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا تھا۔

'دہی بڑوں کا کوئی موسم ہوتا ہے...؟' ذرا رک کے تھے ڈیڈ، پہلے کی طرح پرسکون لہجہ

میں بولے۔ 'دراصل یہاں تم دہی بڑا اور موسم کی بات نہیں کر رہے، تم ان دونوں کے چشمہ سے میری عمر کو دیکھ رہے ہو... اکثر دیکھتے ہو... اکثر لوگ دیکھتے ہیں... برخوردار... جیون کا پہیہ عمر سے نہیں من کی طاقت سے چلتا ہے...' ڈیڈ نے لکڑی کا چمچ دونے کے کونے کونے میں گھمایا تھا۔ 'پر تم' اتنی سردی میں، اتنی رات کو، کہاں جا رہے ہو...؟'

حالات بدل گئے تھے۔ جملے کو توڑ توڑ کر ڈیڈ نے جو الٹ بانسی کی تھی اس سے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ 'کہاں جا رہا ہوں...؟' کہاں تو اسے اتنی دیر تک ان کے غائب رہنے کی وجہ پوچھنی تھی اور پوچھ کر اپنی کھیج کو شانت کرنا تھا، کہاں اب اسے اپنی صفائی سوچنی پڑ رہی تھی۔ اس مضحکہ خیز، بے بس حالات کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔

'میں تو آپ کو دیکھنے نکلا تھا...'

'مجھے دیکھنے... کیا میں بچّہ ہوں... سونو ہوں... کیا میں اپنی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا... دیکھو مسٹر...'

'اوکے... اوکے...' سپردگی کا تاثر۔ 'چلیے، گھر چلتے ہیں...' زبردست صبر و استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کی خواہش ہو رہی تھی، زور زور سے چیخے، چیخنے لگے۔

وہی ہوا تھا۔ ڈیڈ چھینکنے لگے تھے۔ چھینکنا شروع کرتے تو چھینکوں کی لڑی جھڑی لگا دیتے۔ بڑی نے جلدی جلدی جوشاندہ اونٹا، چھوٹی لے کر کمرے میں گئی۔ سوچا، کمبل ومبل اوڑھ کر لیٹے ہوں گے ڈیڈ۔ لیکن ڈیڈ تو... کمپیوٹر پر فیس بک کھلا ہوا تھا۔ تھوڑا جھکے، مانیٹر پر آنکھیں گڑائے، ڈیڈ نیٹ سرفنگ میں مصروف تھے۔ جوشاندہ کا پیالہ ماؤس کے پاس رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔ خوبصورت گھنے بالوں والی تھی وہ، جس کی پروفائل ڈیڈ غور سے پڑھ رہے تھے۔ اس نے ہڑبڑا کر پیالہ رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

'رکو...' ڈیڈ کی رعب دار آواز گونجتے ہی اس کے پیر زمین سے چپک گئے۔ کھڑی ہو کر ان کی آواز کی اگلی کڑی کا انتظار کرنے لگی۔

'برکھا وستھی ...میری نئی فرینڈ...گڑگاؤں کی ہے..عمر 31 سال...انٹیریئر ڈزائنر ہے۔ جانتی ہو، کل میں نے اسے فرینڈ بننے کے لیے انویٹیشن بھیجا تھا...میرا انویٹیشن قبول کر اس نے مجھے 'ہائے' کہا ہے...' ڈیڈ مچل اٹھے تھے۔ '...اور اسی کے ساتھ میرے نائنٹی نائن فرینڈ ہو گئے...' ان کا جوش اور ولولہ دیکھنے کے قابل تھا۔

ڈیڈ مانیٹر پر کچھ اور جھک گئے تھے۔ 'ار...رے...یہ کیا...؟' ان کا جوش مزید بڑھ گیا تھا۔

برکھا آن لائن تھی۔ ڈیڈ کو چیٹ کی دعوت دے رہی تھی۔

'بیٹھو بیٹھو...چیٹ کرتے ہیں...' ڈیڈ نے چھوٹی کا ہاتھ پکڑ کر پاس میں بیٹھا لیا تھا۔

'ہائے...آپ کون ہیں؟' ادھر سے برکھا پوچھ رہی تھی۔

'میں اے پی شرما...انردھ پرساد شرما...' ڈیڈ میسیج باکس میں ٹائپ کرنے لگے۔

'آپ نے میرا پروفائل دیکھا ہوگا...ریٹائرڈ ریلوے ملازم ہوں...دو بیٹے ہیں...دہلی میں کچھ کچھ کرتے ہیں...دونوں بہویں تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں...آپ کو دھرتی پر جنت اگر دیکھنا ہے تو میں آپ کو 'شرماولا' آنے کی دعوت دیتا ہوں...'

'رومانس...؟'

ڈیڈ پھڑک اٹھے تھے۔ چھوٹی کے کان کے پاس منہ لے جا کر پھسپھسائے، 'رومانس کے بارے میں پوچھ رہی ہے...' اس قدر دھیمی آواز کہ برکھا سن نہ لے۔ 'بتاؤ...بتاؤ کیا لکھوں اسے...؟'

چھوٹی اکبکا گئی۔ ڈیڈ کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا کہے، اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔

ذرا دیر انتظار کے بعد ڈیڈ خود ہی جواب ٹائپ کرنے لگے تھے۔

'میرے خیال سے رومانس کوئی خاص واقعہ یا عمل نہیں ہوتا...یہ ایک نظریہ ہے...مثبت بھی...منفی بھی...یہ آپ پر انحصار کرتا ہے کہ آپ زندگی میں مثبت ہیں یا منفی...زندگی

میں ملنے والا ہر درد... ہر خوشی... ہر جیت... ہر ہار، عمر کا ہر پڑاؤ... پوری کی پوری زندگی... پیدا ہونے سے لے کر موت تک کا پورا سفر، رومانس ہے... پوری زندگی ہی رومانس ہے... اس کی وسعت کو کسی دائرے میں محدود کرنے کے حق میں میں نہیں... اسے اس کے حقیقی شکل...'

چھوٹی کو نیند آرہی تھی۔ بار بار منہ پھاڑ کر جمائی لے رہی تھی۔ نہ جانے ڈیڈ کا یہ دوستانہ کب تک چلنے والا تھا۔ دروازہ پر آکر چھوٹے کئی بار اشارہ کر گیا تھا، اپنا سر پیٹ گیا تھا۔ ڈیڈ بھی جو ہیں نا... خود تو اس عمر میں... آج تو بری طرح پھنس گئی تھی وہ۔ اس نے قصداً منہ کو پورا پھیلا کر جمائی لی۔ 'ڈیڈ... بارہ بج گئے...'

ڈیڈ کا ذہن وقت کی جانب مبذول ہوا۔ 'ارے ہاں' جاؤ جاؤ، سو جاؤ...' ڈیڈ نے ایسے کہا تھا جیسے اسے جانے کی اجازت دے کر اُس پر بڑا سا احسان کیا ہو۔

رات میں سردی بارش بن کر برس گئی تھی۔ صبح سب کی آنکھیں کھلیں تو تیز بھیگی ہوئی، کنکنی ہوا چل رہی تھی۔ گھر آنگن، گلی محلّہ کچ کچ ہو رہا تھا۔ ڈیڈ کے کمرے میں دیکھا گیا تو ڈیڈ نہیں تھے۔ مارننگ واک پر نکل گئے تھے۔ بڑے کا دماغ گرم ہو گیا تھا۔

'بتاؤ تو... پوری رات کھائیں کھائیں کیے ہیں... اور اتنے خراب موسم میں مارننگ واک سوجھ رہی ہے بڑھئو کو... میں تو کہتا ہوں، آج ہمیں انہیں اچھی طرح سمجھانا ہی ہوگا... دیکھو چھوٹے... تمہیں بھی اگر چین سے رہنا ہے تو... ہمیں منہ کھولنا ہی ہوگا... ارے یار، اب تو حد ہو گئی... اس طرح بھی کوئی...'

جوتوں کی دھمک سنائی دی تھی۔ یقیناً ڈیڈ ہوں گے۔ ڈیڈ کے جوتوں کے علاوہ، ایسی دھمک کوئی اور پیدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ آٹا چالتی بڑی، لوکی کترتی چھوٹی، ڈاڑھی بناتا بڑے، اِستری کرتا چھوٹے اور دانت مانجھتا سونو، لمحہ بھر کے لیے سب کے ہاتھ جہاں تھے، وہیں رک گئے تھے۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے الجھ گئی تھیں۔ 'کھڑا کیا ہے... جا کر دیکھ نا۔' بڑی نے منہ سے کم آنکھوں سے زیادہ کہا تھا

سونو سے۔ وہ گیا، آیا۔ ہاں میں گردن ہلائی۔ لوکی کترنا چھوڑ چھوٹی نے برآمدہ میں جھانکا تھا۔ چینل کے باہر ڈیڈ پیر پٹک کر جوتوں میں لگی کیچڑ جھاڑ رہے تھے۔

'اوف' اتنی کیچڑ... پھر دلی میں رہنے کا کیا فائدہ... گاؤں ہی ٹھیک ہے...'

محض اتنا ہی سن پائی تھی وہ۔ کلیجہ دھک... اب گاؤں جانا پڑے گا... چینل کھول برآمدے میں آ کر ڈیڈ جوتا کھولنے لگے تھے۔ جھکا جھک سفید جوتا کیچڑ سے گدڑی بن گیا تھا۔ اس درمیان چھوٹی سے بڑی تک، بڑی سے بڑے تک، بڑے سے چھوٹے تک اور چھوٹے سے سونو تک پھس پھس کرتی لیکن تیز رفتار سے بات پہنچ گئی تھی، اب گاؤں جانا پڑے گا۔ کیوں رات میں بوندا باندی ہوگئی... کیوں ڈیڈ اس موسم میں بھی ٹہلنے نکل گئے ...کیوں ان کے جوتوں میں کیچڑ لگ گئی... کیوں... کیوں... اچانک نہ جانے کتنے سوال سبھی کے دلوں کو کچوٹنے لگے تھے۔

'بڑے...' یہ ڈیڈ کی آواز تھی۔ ہوگئی چھٹی۔ اب باندھو بوریا بستر...

'گاؤں جانا ہے ڈیڈ...؟' سامنے حاضر ہوتے ہی بڑے نے پوچھا تھا۔

'گاؤں...' ڈیڈ اکھڑ گئے تھے۔ گاؤں جا کر کیا کروگے تم لوگ؟ گاؤں میں تم لوگوں کا گزارا ہوگا؟ چلے ہو گاؤں جانے... تم تو اتنا کرو کہ میونسپل کمشنر کے نام ایک درخواست لکھو... وارڈ میں اتنی گندگی ہوگئی ہے کہ... آخر ہم ٹیکس کس بات کا دیتے ہیں...؟'

سبزی چھونکتی بڑی، ڈیڈ کا جوتا صاف کرتا چھوٹے اور جوتے کی کیچڑ سے کچ کچ ہوگئی فرش پر پوچھا لگاتی چھوٹی کی ٹھہری ہوی سانسیں چلنے لگیں۔ سب نے بیک وقت ایک ساتھ راحت کی سانس کھینچی۔

ڈیڈ نے اپنے کمرے میں فولڈنگ ڈال ایک اور بستر لگانے کا حکم دیا تھا۔ گاؤں سے گجادھر چاچا آ رہے تھے۔ ان کے آنے کی خبر پا کر ڈیڈ میں بے انتہا جوش بھر گیا تھا۔ یوں تو گاؤں سے اکثر کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا۔ ڈیڈ نے پورے گاؤں والوں سے

کہہ رکھا تھا، جب بھی کسی کو، کسی کام سے دہلی آنا پڑے، اسے 'شرماوِلا' کو چھوڑ کر کہیں اور رکنے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اوپن ٹنڈر کی طرح اس کھلی دعوت کا فائدہ گاؤں والے خوب اٹھاتے تھے۔کوئی کام کی تلاش میں، کوئی علاج کرانے کی غرض سے، کوئی قطب مینار، لال قلعہ دیکھنے...خواہ جس کسی غرض سے دہلی آتا ہو، ٹھہرتا تھا 'شرماولا' میں ہی۔اور جتنے دن تک ٹھہرتا تھا، اس کی خاطر توجہ میں 'شرماولا' کا ایک ایک فرد لگا رہتا تھا۔ان کے کھانے پینے سے لے کر ہر ضروریات پر توجہ دینی پڑتی تھی۔

گجادھر چاچا کو لے کر ڈیڈ زیادہ حساس تھے۔ڈیڈ کی دانت کاٹی روٹی کھانے والے تھے۔بچپن میں، ڈیڈ کے ساتھ اونچے اونچے، سفید چکنے پیڑوں پر چڑھ کر کیتا اور کھیتوں میں سے بھٹا چرانے والے صرف ایک وہی بچے ہوئے تھے۔ڈیڈ آج بھی ان کیتوں کی سہرن پیدا کر دینے والی ترشی اور بھنے ہوئے بھٹوں کی نرم نرم گرمی اپنے دانتوں کی جڑوں میں محسوس کیا کرتے تھے۔باڑھ کا پانی اترنے کے بعد ندی میں پیلا ٹینگرا اور کالا کالا کینکڑا پکڑنے میں جو پورا کا پورا دن گذرتا تھا، اس کا بکھان کرتے ہوئے ڈیڈ اتنا جذباتی ہو اٹھتے تھے کہ آنکھوں کی کوروں سے پانی رسنے لگتا تھا۔

گجادھر چاچا دہلی آرہے تھے۔وہی گجادھر چاچا، جو کبھی ٹرین پر نہیں چڑھے تھے۔چڑھتے ہی نہیں تھے۔کہتے، 'دو اِنچ کی پٹری پر چلے لے ٹرینوا...ایکر کا بھروسہ...' کہیں آنا جانا ہوتا تو بس وس سے ہی، ورنہ نہیں۔پہلی بار ڈیڈ نے انہیں ٹانگ ٹونگ کر طوفان ایکسپریس میں بیٹھایا تھا اور دلی لے کر آئے تھے۔گجادھر چاچا پورا سفر دم روکے ہوئے تھے۔جب سہی سلامت دلی پہنچ گئے تو ایسا تاثر ان کے چہرے پر تھا جیسے غضب ہو گیا ہو۔لیکن چسکا بھی لگ گیا گجادھر چاچا کو۔جب جی میں آتا، من کرتا 'تو پھنوا' پر چڑھ جاتے۔پھر ڈیڈ اور گجادھر چاچا، دونوں جب ملتے تو لگتا دنیا انکی ٹھوکروں پر آگئی ہو۔پورا پورا دن قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ...نہ جانے کہاں کہاں کھمکڑی کرتے، چوکڑی

بھرتے رہتے۔آنے سے قبل گجادھر چاچا جب مطلع کرتے تو ڈیڈ کہتے 'ستوا لیتے ایہا، اِیہیجا لِٹّی چوکھا لگاوے کے...'

گجادھر چاچا ستو لے کر آتے تھے اور ڈیڈ پورے گھر کو ناچ نچا کر رکھ دیتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لِٹّی چوکھا کے لیے کنڈے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

گجادھر چاچا جب تک رہتے، ڈیڈا یکدم سے بدلے ہوئے رہتے۔ان کا ایک ایک پل گجادھر چاچا کے نام منسوب ہوتا۔دو دو بجے رات تک اور کبھی کبھی تو صبح ہو جایا کرتی ،لیکن گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔گاؤں کی سڑک پکی ہو گئی ہے...مکھیا کے چناؤ میں گاؤں دو پھانک ہو گیا ہے...دلتوں نے غیر مزروعہ زمین کے پٹا کے لیے بلاک کا گھیراؤ کیا...نہ جانے کتنی باتیں، کوئی اور چھور نہیں ہوتی تھی۔اور آخر میں بات پھر وہیں آ جاتی تھی، تڑبنّے میں کھجور کے پیڑوں پر لٹکتی ہوئی تاڑی کی لبنی...ادھواڑ سے اس پر نشانہ لگانا...تیز پرویّا میں تاڑی کا چھر چھرا کر گرنا اور اسے چلّو میں بھر کر سڑ سڑ پینا...

لیکن تھے تو ڈیڈ کے لنگوٹیا یار ہی۔ بہت ساری یکسانیت رکھتے تھے۔سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھا، صبح صبح مِرانڈا کی دو لیٹری بوتل میں پانی بھر کر بس میں بیٹھا کر ان کو دور لے جانا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ دن بھر طبیعت مچلاتی رہتی تھی۔دراصل گجادھر چاچا ٹائلٹ میں 'فریش' نہیں ہو پاتے تھے۔انہیں بس کے ذریعہ دور کھلے میں 'جھاڑا' کے لیے لے جانا پڑتا تھا۔وہ کھلے میں ہی صبح کے معمول سے فارغ ہو پاتے تھے۔ظاہری بات تھی، اس نیکی کے لیے اکثر چھوٹے ہی مہیا ہوا کرتا تھا۔خود کو ٹھیل ٹھال کر جاتا تھا، بھنبھناتا تھا، 'ایک کیا کم تھے جو یہ دوسرے بھی...'

گجادھر چاچا آئے تو گھر میں ہلچل بڑھ گئی۔ 'کا ہو چھوٹکا ببوا...کا ہو بڑکا ببوا...کا حال با تو ہر لوگن کے...'ان کی زبان سن چھوٹی پورے منہ میں ساڑی کا پلّو ٹھونس ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔سو نو نقل اتارتا تو بڑی جھڑکتی۔ بڑے بھی جھلاّتا۔ ڈیڈ جو ہیں نا...سوچنا

چاہیے، گھر میں ایک بچّہ ہے...

سچّائی یہ تھی کہ گھر میں اس وقت دو اور بچّے تھے۔ رات کے بارہ بجے لوڈو کھیل رہے تھے۔ ڈیڈ نے پاسا پھینکا... چھکا... ایک... دو... تین... چار... پانچ... اووَ رہئی چھ... مار دینی... چل گھر میں گھس جا... گوٹی پٹ جانے سے گجادھر چاچا کا منہ لٹک گیا تھا جب کہ ڈیڈ زور زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے، 'اے... اے... گجوا... منھ دیکھ اپنا... کیسَن لٹک گیئل باہو...'

اب باری گجادھر چاچا کی تھی۔ پاسا پھینکا تو چار آیا۔ ایک... دو... تین... اووَ رہئی مرنی چار... اتفاق سے ڈیڈ کی گوٹی بھی پٹ گئی۔ گجادھر چاچا تو جیسے اچھلنے کودنے لگے۔ 'آہو بڑکا ببوا... آہو چھوٹکا ببوا... تنی شیشا لے آوہو... بابو کے منھ دِکھاد...'

بغل والے کمرے میں بڑے پھرکی کی طرح ناچ رہا تھا، 'یہ گھر ہے یا چڑیا گھر...؟ خود تو سوتے نہیں، دوسروں کا آرام بھی حرام کیے ہوئے ہیں...'

نہیں رہا گیا اس سے۔ ڈیڈ کے کمرے میں پہنچا۔

'ڈیڈ...'

دونوں حلق پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ 'اچھا ہوا تم آ گئے بڑے...' نہیں تھم رہی ہنسی کو تھامنے کی محض کوشش سی کرتے ہوئے ڈیڈ نے کہا، '...دو کپ چائے کے لیے بڑی سے کہہ دو... اور تم، ابھی تک سوئے نہیں...؟ تمہیں صبح کام پر نہیں جانا کیا؟' پھر ہنسی کا ابال۔ بڑے پھین کی طرح بہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، سارا غصہ بڑی پر نکلا، 'انہیں چائے کیوں نہیں دے آتی...'

بڑے کا منہ دیکھتے رہ جانے کے علاوہ بڑی کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک ہفتہ رہنے کے بعد گجادھر چاچا گاؤں لوٹ گئے تھے۔ پر ڈیڈ کے اندر نہ جانے کتنی توانائی بھر گئے تھے۔ اب انہیں موسم کی نرمی گرمی کی رتّی برابر بھی پرواہ نہیں رہ گئی تھی۔ ساری بندشوں، رکاوٹوں کو تہس نہس کر جس طرح بے لگام دریا بہتا ہے، اسی طرح ڈیڈ بہہ رہے تھے۔

اس دن بڑے کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ سگریٹ کی بو آرہی تھی۔ اس نے نتھنوں کو سکوڑا، پھیلایا۔ سگریٹ کی بو ہی تھی۔ ڈیڈ کے کمرے سے آرہی تھی۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی، ڈیڈ سگریٹ پی رہے ہیں... دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر وہ ڈیڈ کے کمرے میں پہنچا۔

'ڈیڈ...' کمرے میں دھواں اور اس کی کسیلی گندھ بھری ہوئی تھی۔

ڈیڈ نے ضد بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

'ہم لوگ تنگ آگئے ہیں ڈیڈ... آخر کیا چاہتے ہیں آپ...؟'

'تم لوگ کیا چاہتے ہو...؟' ڈیڈ کی الٹ بانسی۔ لیکن بڑے مضطرب نہیں ہوا۔

'محلّے میں اور بھی بوڑھے ہیں...'

'ہاں سچ مچ... وہ بوڑھے ہیں...'

'ڈیڈ آپ...'

'ٹھیک ہے...'

اس رات سانس کی بیماری نے زور پکڑ لیا تھا۔ ڈیڈ پوری رات نہیں سو سکے۔ پوری رات ایک ایک فرد، ایک ایک پیر پر کھڑا رہا۔ بڑی تیل گرم کر کر کے مالش کرتی رہی، چھوٹی اِنہیلر کی پچکاری دیتی رہی، بڑے پیٹھ دباتا رہا، چھوٹے چھاتی سہلاتا رہا، سانس لینے میں کافی دشواری... سونو گہری سانسیں چھوڑتا رہا... پلنگ سے نیچے پیر لٹکائے، دونوں ہاتھوں کو بستر پر ٹکائے، اکھڑی اکھڑی سانسوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے ڈیڈ... رات کے آخری پہر میں ڈیڈ کی آنکھ لگ گئی، پھر نہیں کھلی۔

اے پی شرما... انردھ پرساد شرما یعنی ڈیڈ نہیں رہے۔ نہیں رہے تو 'شرماولا' میں بہت ساری حرکتیں بھی نہیں رہیں۔ ڈیڈ کے سبب ایک ایک کی، جو جسمانی اور ذہنی مصروفیت بنی رہتی تھی، اس سے ایک ایک کو نجات پانے جیسا احساس ہونے لگا۔ ایک ٹھہراؤ... سکون جیسا کچھ محسوس ہونے لگا۔ سر پر سے کوئی وزنی سی چیز ہٹ جانے سا لگنے لگا۔ ذہن کو آرام کا

سا گمان ہونے لگا۔ پرسکون، آرام دہ صبح اور اسی طرح کی رات۔ بڑے اور بڑی، چھوٹے اور چھوٹی اپنے اپنے کاموں میں، اپنی اپنی مصروفیت میں...

اس دن... اس وقت... بڑی کچن سے نکلی، چھوٹی اپنے کمرے سے... بڑے چھت پر سے بھاگا، چھوٹے برآمدہ سے...

سب ایک ساتھ ڈیڈ کے کمرے میں تھے۔

ڈیڈ کی آواز سنائی دی تھی۔

بڑے، میرا ہیٹ کہاں ہے؟

چھوٹی، ایک کپ چائے دینا۔

بڑی، جوشاندہ کا کیا ہوا؟

چھوٹے، میرا جوتا صاف ہوا کہ نہیں؟

ڈیڈ کا بستر... ڈیڈ جس پر بیٹھے ہوتے تھے، خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، سب کی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بڑے دھم سے ڈیڈ کے بستر پر بیٹھ گیا۔ ہتھیلیوں سے چہرہ ڈھک کر پھپھک پڑا۔

'بہت تنگ کرتے ہیں بڑھو...'

○○

۔آمد، پٹنہ، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳
۔چہارسو، پاکستان، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۱۵

جہاد

صغیر رحمانی

جہاد

السلام وعلیکم...

میرا نام شمس ہے۔ مسلمان ہوں۔ اس شہر میں نیا نیا ہوں۔ گھر...؟ آپ نے بھی کیا خوب پوچھا۔ اللہ کی راہ میں جو لوگ نکل پڑتے ہیں، ان کے لیے تو پوری کائنات ان کا گھر ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرا بھی یہ پورا ملک، پوری کائنات میرا گھر ہے۔ دین کی تبلیغ میرا کام ہے۔ دین سے غافل اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لینے کا پیغام لے کر کبھی اس شہر، کبھی اس شہر، کبھی اس قصبہ، کبھی اس قصبہ۔ سچ بھائی جان، اللہ کی بندگی کا یہ چھوٹا سا حق ادا کر کے جو سکون حاصل ہوتا ہے، وہ دنیاوی تمام دولت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

چائے؟ ارے چائے کی زحمت کیوں اٹھائی آپ نے؟ ایک بھائی کا دوسرے بھائی سے خلوص کے ساتھ ملنا ہی بڑی نعمت ہے۔ آپ یقین جانیں، جب میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے مصافحہ کرتے دیکھتا ہوں تو میری بھوک، پیاس سب مٹ جاتی ہے۔

اچھی چائے پلائی آپ نے۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ دراصل اس میں آپ کی، ایک دینی بھائی کی محبت جو شامل ہے۔ اور بتایئے، کون کون ہیں آپ کے گھر میں؟ اچھا اچھا، تین بیٹی، ایک بیٹا۔ آپ کی بیگم اور ایک ضعیف ماں۔ اچھا ایک بھائی بھی آپ کی ذمہ داری میں ہے۔ بچے پڑھتے ہوں گے؟ اسکول میں ہیں؟ میرے بھی چھ بچے ہیں۔ لیکن میں انہیں دینی تعلیم دلواتا ہوں۔ میرے خیال سے مسلمان کے بچوں کو پہلے اپنے دین،

اپنے مذہب سے روشناس ہونا چاہیے۔آج کی نسل اپنے مذہب سے بالکل بے بہرہ ہے۔ قرآن اور حدیث کی جگہ کمپیوٹر کے چوہے پر ریسرچ کرتی ہے۔ سلام کی جگہ ’ہائے بائے‘ کرتی ہے۔ اس سے مسلمانوں کی اپنی تہذیب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسے بچانا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ قوم تاریخ کے پنوں میں سمٹ کر رہ جائے گی۔ دراصل یہ عالمی سطح پر چل رہی سازش کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے، کسی قوم کا نام ونشاں مٹانا ہے تو سب سے پہلے اس کی زبان، اس کی تہذیب کو پامال کیا جاتا ہے، پھر وہ قوم خود بہ خود مر جاتی ہے، اسے مارنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ افسوس! ہم مسلمان اس کو وقت رہتے سمجھ نہیں پا رہے۔ آج ہمارا مذہب پوری دنیا کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس قوم نے دوسرے کا چولا اختیار نہیں کیا ہے۔ اب ایسے وقت میں، جب کہ ہماری تہذیب وتمدن پر چہار سمت سے حملے ہو رہے ہیں، ہمیں اور زیادہ محتاط ہو جانے کی ضرورت ہے۔ بھائی جان، مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میری باتیں پسند آ رہی ہیں، ورنہ آج کے دور میں تو بڑی مشکل ہے کسی کو سمجھانا۔

آج گرمی زیادہ ہے۔ بارش کا امکان ہے۔ پورے دن میں کتنے کپڑے سِل لیتے ہیں؟ چار؟ اللہ آپ کو اس میں برکت دے۔ مجھے تو دین کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن اللہ کا کرم دیکھیے کہ میری اور میرے گھر کی ساری ضرورتیں اللہ پوری فرما دیتا ہے۔ کیوں کہ اس کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے، تم میرا کام کرو، میں تمہیں ایسے رزق دوں گا کہ تم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ اور بے شک اللہ اپنے وعدے کو پورا فرمانے والا ہے۔

اور چائے؟ بھائی جان آپ نے تو خلوص کی انتہا کر دی۔ میں تو آپ کا شیدائی ہو گیا۔ دل جیت لیا آپ نے میرا۔ دراصل، اللہ کا ایک بندہ ہی دوسرے بندے کی قدر کر سکتا ہے۔ میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا، ایک خوشبو مل گئی تھی مجھے، آپ اللہ کے نیک بندے اور سچے مسلمان ہیں۔ ورنہ جب سے آیا ہوں یہاں، لوگوں کو پہچاننے

میں ہی پریشان ہوں۔ کون اپنا ہے، کون پرایا ہے، سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے، نہ داڑھی، نہ ٹوپی، نہ وہ لباس، نہ وہ نور جو ایک مسلمان کے چہرے پر ہوتا ہے؛ اور نام بتاتا ہے۔ اللہ بخش... صرف نام سے مسلمان، باقی مسلمان کی کوئی نشانی نہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے، ان کے نیچے ختنہ بھی ہے کہ نہیں؟ یہاں کے لوگوں کے رسم و رواج، پرب تہوار، رہن سہن، کھان پان، بھیس بھسا، بول چال سب ایک جیسے۔ کون مسلمان، کون کافر؟ سلام کر کے کس پر سلامتی بھیجیں، کس پر لاحول پڑھیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بھائی جان، ایک آپ کو دیکھا تو لگا، کوئی اللہ کا بندہ ہے۔ دیکھیے تو اسے کہتے ہیں مسلمان۔ سلیقے کا لباس، سینے تک لہراتی داڑھی، چہرے سے ٹپکتا نور۔ دور سے دیکھنے پر ہی ایمان کی خوشبو سے دل معطر ہو اُٹھتا ہے۔

بھائی جان اپنا چہرہ غور سے دیکھنے دیجیے، سکون ملتا ہے... آج پوری دنیا میں مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ نہ ان کی عزت و آبرو سلامت ہے، نہ ہی جان و مال۔ جب کہ یہ قوم صرف اور صرف سرخرو ہونے کے لیے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان گھوڑے کی پشت اور شمشیر کی دست چھوڑ کر ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم، کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔ جب تک اس نے ان دونوں کو تھامے رکھا دنیا اس کے قدموں میں رہی، جیسے ہی اس نے انہیں چھوڑا، وہ زمانے کی ٹھوکروں میں آ گیا۔

بھاگلپور، میرٹھ، ممبئی، گجرات... کہاں نہیں انہیں روندا گیا۔ ہر جگہ انہیں پامال کیا گیا۔ یہ اپنے ہی ملک میں دوسرے درجہ کے شہری کی حیثیت سے رہتے ہیں اور انہیں 'بندے ماترم' کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ آئے دن ان پر پاکستان اور بنگلہ دیش جانے کا فرمان جاری ہوتا رہتا ہے۔ ایران، عراق، افغانستان، پاکستان... پوری دنیا میں ان کی جڑیں کاٹنے کی جو مہم چل رہی ہے، اس کا تو انہیں گماں تک نہیں ہو رہا ہے۔ بھید بھاؤ، نابرابری اور نفرت کی شکار یہ قوم اب بھی غفلت میں پڑی خیالی پلاؤ پکانے اور سبز باغ دیکھنے

میں محو ہے۔

دراصل آج کا مسلمان یہ بھول گیا ہے کہ... یہ مذہب تلوار کے زور پر پھیلا اور پروان چڑھا ہے...وہ...

کیوں... کیا ہوا؟ آپ کچھ پریشان اور بے چین دکھنے لگے... مشین میں کچھ گڑبڑی آ گئی کیا؟ میں نے آپ کا وقت بھی بہت لے لیا۔ اچھا بھائی جان، پھر ملاقات ہوگی...اللہ حافظ...۔

السلام وعلیکم بھائی جان!

آپ سے مل کر جانے کے بعد میں لگاتار آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ بار بار آپ کا نورانی چہرہ میری آنکھوں میں تیرتا رہا۔آپ جیسے ہی کچھ بندے ہیں، جن سے دین بچا ہوا ہے۔اللہ ہر دور میں دین کی حفاظت کے لیے اپنے کچھ خاص بندوں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ بے شک اُن میں سے ایک آپ ہیں۔ باقی تو سب ایمان کوگروی رکھ گمراہی کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔آپ یقین کریں بھائی جان، ایسے مایوس کن ماحول میں اللہ نے آپ کو کچھ خاص ذمہ داریاں دے کرکسی خاص مقصد سے دنیا میں بھیجا ہے۔

بھائی جان!میں جب جب آپ کا چہرہ غور سے دیکھتا ہوں، بے حد سکون پاتا ہوں۔افسوس! مسلمان کیا تھااور آج کیا ہوگیا ہے۔جس کی ایک نظر سے تقدیر بدل جایا کرتی تھی، جس کی ایک جنبش سے تاریخ بدل جایا کرتی تھی، آج ویسے مسلمان صرف تاریخ کے پنوں پر ہی دکھائی دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کا مسلمان...آج کا مسلمان 'جہاد' لفظ کواپنی زندگی سے نکال کر پھینک چکا ہے۔ جہاد اللہ کو بے حد پسند ہےاوراللہ نے ہر مسلمان پر جہاد فرض کیا ہے۔اتنا ہی نہیں، جہاد کوعبادت کا درجہ حاصل ہےاور جہادیوں کو اللہ نے جنت کا حقدار بنایا ہے۔

بھائی جان! آج اپنی محبت والی چائے نہیں پلائیں گے؟ بخدا اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔

...لیکن بھائی جان، آج کے مسلمان کو نہ دین کی فکر ہے، نہ ایمان کی۔ وہ تو بس کباب روٹی کے نوالے توڑنے میں مصروف ہے۔ اللہ بھی اس کو تب یاد آتا ہے، جب اس کی بستیاں جلائی جاتی ہیں یا اس کا گھر اُجاڑا جاتا ہے یا اس کے سامنے اس کے بچوں کو نیزے پر اٹھایا جاتا ہے۔ تف ہے ان شیروں پر، یہ سب دیکھ کر جس کے اندر کا خون ابلنے نہیں لگتا۔ بھائی جان، سیدھی سی بات ہے، آج اگر جینا ہے تو مرنے کے لیے تیار رہنا پڑے گا، جہاد کرنا پڑے گا۔

شکر ہے کہ ہمارے کچھ بھائی اللہ کے اس عظیم کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنا گھر بار، بال بچے چھوڑ کر رات دن جہاد کر رہے ہیں۔ اللہ کے یہ نیک بندے دین کی حفاظت میں خوشی خوشی شہید بھی ہو رہے ہیں لیکن ان کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔ اللہ اپنے جاں باز سپاہیوں کے ساتھ ہے۔ ایک سپاہی شہید ہو رہا ہے تو دس پیدا ہو رہے ہیں۔ اللہ کی راہ میں قربان ہونے کا ایسا جذبہ تو صرف اور صرف میدان کربلا کے واقعہ میں ہی ملتا ہے۔ دیکھنا بھائی جان، ایک دن پوری دنیا سے کفر کا نام ونشاں مٹ کر رہے گا، پوری دنیا میں حق کا پرچم لہرائے گا۔

جگہ جگہ ہونے والی آتش بازی کی گونج آپ کے کانوں تک پہنچتی ہوگی، کفر کے ہوا میں اڑتے چیتھڑے آپ ٹی وی پر دیکھتے ہوں گے... چیخ پکار... دہشت... یہ آندھی رکنے والی نہیں ہے بھائی جان... اس وقت تک... جب تک دجال کا خاتمہ نہیں ہو جاتا... اللہ کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ اس نے اس دور کے مسلمانوں کو اتنا عظیم موقع عطا کیا ہے... جنت کا دروازہ کھلا ہے... بس ہمیں اس میں داخل ہونا ہے...

اس لیے میں نے کہا، اللہ نے آپ اور مجھ جیسے مسلمانوں کو کچھ خاص مقصد سے

دنیا میں بھیجا ہے اور ہم دونوں کو اسی مقصد سے اس نے ملایا ہے۔ آج اگر ہم سوچتے رہ گئے تو سمجھیے، کل اللہ کے سامنے ہم منھ نہیں دکھا پائیں گے۔ وقت ہمیں پکار رہا ہے بھائی جان، آؤ، جنت میں گھر بنالو۔ ہمارا ارادہ نیک ہے...ہم دین کے راستے پر ہیں...ہم اللہ کا کام کر رہے ہیں...ہم ضرور کامیاب ہوں گے بھائی جان...تاریخ گواہ ہے، میدان خیبر ہو یا جنگ اُحد، ہر بار حق کے لیے خون بہا ہے...خون تو جہاد کی بنیاد میں ہے...

ارے ارے، وہ شخص آپ کے پاس بھاگتا ہوا کیوں آرہا ہے؟ ارے کیا کہا اس نے؟ آپ اتنا پریشان کیوں ہو گئے؟ اس طرح بدحواس کہاں چل دیے؟ ارے میری بات تو سن لیجیے...

''میرا پڑوسی ایک حادثے میں زخمی ہو گیا ہے...اسے خون کی ضرورت ہے...میرا اور اس کا خون ایک ہی ہے...''

OO

۔راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۹
۔اترا (ہندی) کہانی نمبر، شمارہ ۱۶

لیکن یہ ---

لیکن یہ...

سفید کرتا پاجامہ اور سر پر گول ٹوپی۔ کندھوں پر پھیلا چار خانے کا گمچھا... ہاں وہی ہیں... وہی... وہی وہی...

کریم بخش کو تھانے کی سیڑھیاں چڑھ کر آتا دیکھ کر تھانے دار کے ساتھ ساتھ پولیس عملہ کی آنکھیں حیرت واستعجاب سے پھیل گئی تھیں۔ یہ کیسا منظر تھا؟ کریم بخش... اور تھانہ میں...؟ خواب تو نہیں تھا؟ جوں جوں کریم بخش قریب آرہے تھے، حقیقت صاف ہوئی جارہی تھی لیکن... لیکن یہ... یہ کیسے ممکن تھا؟

کریم بخش... اس محلّہ ہی نہیں، علاقے بھر کا سب سے معزز اور محترم انسان، جس کی قدر بچہ بچہ کے دلوں میں تھی، جو ہندو مسلم سبھی جماعت میں یکساں طور پر تعظیم وتکریم کا حامل تھا۔ ایک اکیلا آدمی ایسا نہیں مل سکتا جو کہے کہ اسے کریم بخش سے کوئی شکایت ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ مراتب ان کو وراثت میں ملے تھے یا وہ دولت مند تھے یا ان کے پاس بازو کا زور تھا۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ کتابوں پر جلد سازی کر اپنا اور اپنے پریوار کا گزر بسر کرنے والے کریم بخش صبح صبح دو گھنٹے محلے کے بچوں کو مفت اردو اور عربی کی تعلیم دیتے تھے۔ سفید رنگ کا کرتا پاجامہ، سر پر گول ٹوپی اور کاندھے پر پھیلا چار خانے کا گمچھا ان کی پہچان تھا۔ ابھرے ناک، پچکے گال اور کھچڑی داڑھی میں بالکل معمولی دکھنے والے کریم بخش نے لوگوں کا دل اپنے میٹھے بول اچھے اخلاق کی بدولت جیتا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا، ہاتھ کیا ان کی زبان تک سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ عزت انھوں نے انسانوں کی خدمت اور انسان انسان کے بیچ فرق نہ کر کے حاصل کی تھی۔ سب کا عزیز، سب کو پیارا

کریم بخش۔انسانیت، بھائی چارہ اور محبت کے لیے وقف کریم بخش۔ ایسا انسان تھانہ یا کورٹ کچہری میں دِکھے تو غیر فطری ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے۔ برآمدہ کو پار کر ٹیبل کے سامنے آ کھڑے ہوئے کریم بخش تو تھانے دار کو گویا ہوش آیا۔اس نے غور سے کریم بخش کو دیکھا۔ ہر دم مسکان کے ساتھ پرسکون رہنے والا شہرہ آج کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔آنکھوں میں فکر کی سرخ پرچھائیاں عیاں ہو رہی تھیں۔

'کریم صاحب آپ...اور یہاں...؟'

'دراصل مجھے ایک رپورٹ...'

کریم بخش کی پیشانی بھیگی ہوئی تھی۔ تھانے دار نے انھیں بٹھایا، پانی کا گلاس دیا۔

'کسی نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے...؟'

'نا نا...نہیں...دراصل...اسے کچھ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے...وہ ابھی تک لوٹا نہیں ہے...مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کا اغوا...'

'اغوا...کس کا...؟'

'میرے بیٹے...محمد اس...'

'کیا...؟ اسلام کا اغوا...؟ لیکن اس کا اغوا کیوں ہوگا...؟ میں جانتا ہوں اسے...وہ تو بہت ہی شریف...نیک اور...'

'یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی...اللہ کے ان بندوں کو میرے بیٹے سے کیا بیر ہو سکتی ہے...؟ میرا بیٹا تو نادان...'

'آپ فکر نہ کریں...ہم پتا لگاتے ہیں...ہم اپنی پوری طاقت...'

تھانے دار کی باتوں سے کریم بخش کو خاطر خواہ ہمت بندھی تھی لیکن پیشانی کی سلوٹیں بدستور اپنی جگہ پر قائم تھیں۔

....

کئی روز گزر گئے۔ صبح صبح تھانے دار کی جیپ ان کے گھر کے سامنے رکی تو کریم بخش کے دل میں امید کی کرن پھوٹ پڑی۔ طالب علموں کو چھٹی دے کر وہ تھانے دار کی طرف لپکے۔

'کریم صاحب... میرے خیال سے...' ذرا دیر رُک کر تھانے دار سوچنے لگا، پھر بولا۔

'میرے خیال سے... اسلام دہشت گردوں کے ہاتھ لگ گیا ہے...'

'یہ آپ کیا... کیا کہہ رہے ہیں...؟' کریم بخش کو سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

'شاید... خبر کے مطابق... جو لوگ اس کے ساتھ تھے... ان پر ایک بین لگی تنظیم کے ممبر ہونے کا شبہ ہے... ویسے میں تفتیش میں لگا ہوں... اور جانکاریاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں...'

'یا اللہ... اسلام کی حفاظت فرما...' کریم بخش کی آواز رک رک کر نکلی۔ 'نہ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں...' وہ پھپھک کر رو پڑے اور بے جان سا کرسی پر گر پڑے۔

رات کو کریم بخش کی آنکھوں میں کسی بھی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار بیٹے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے تیر رہا تھا۔ نہ جانے کہاں ہوگا...؟ کمرے میں اندھیرا تھا، خاموشی تھی۔ کریم بخش کو اپنی سانسوں کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی اور سنائی دے رہی تھی کچھ رینگنے کی آواز... بلاشبہ یہ وقت تھا... نامساعد گھڑی کا بے رحم وقت... رینگ رہا تھا بہت دھیمی رفتار سے، گویا زیادہ تکلیف دینا چاہتا ہو، کرب پہنچانا چاہتا ہو۔ وقت جیسے جیسے رینگ رہا تھا، اس کے نکیلے پنجے کریم بخش کی روح کو کھروںچتے جا رہے تھے۔ تاریکی کے باوجود اپنی روح سے ٹپ ٹپ ٹپکتے خون کی بوندوں کو کریم بخش صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔ فجر کی نماز

کا وقت ہوا تو بستر چھوڑنے کی خواہش نہیں ہوئی، گویا جسم کھاٹ سے چسپاں ہو گیا ہو۔ کسی پہلو اٹھ کر انھوں نے وضو کیا اور سر کو سجدے میں جھکا دیا۔ انھیں نہیں معلوم، کتنی دیر وہ سجدہ میں گرے رہے۔ صبح ہوئی، طالب علموں کا آنا شروع ہوا تو وہ سجدہ سے اٹھے۔ ان کا پورا جسم گھاؤ بن کر ٹیس رہا تھا۔ آج انھوں نے طالب علموں کو بنا سبق رٹائے چھٹی کر دی اور دوبارہ مصلیٰ بچھا کر مقدس کتاب قرآن کی تلاوت کرنے لگے۔ تلاوت میں وہ اس قدر منہمک رہے کہ انھیں دن چڑھنے اور تھانے دار کے آنے کا احساس تک نہ ہوا۔ تھانے دار انتظار کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے آواز دی تو کریم بخش چونک پڑے۔

'آپ جن شلوکوں کو پڑھ رہے تھے ابھی... کیا ان کا مطلب بتائیں گے مجھے...؟'

کریم بخش نے بوجھل آنکھوں سے تھانے دار کو دیکھا، مصلیٰ سمیٹتے ہوئے کہا۔

'جس نے کسی جرم کے بغیر کسی کا خون کیا اور زمین پر فساد برپا کیا، اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا...'

'لوگ مانتے بھی ہیں ایسا...؟'

'اس کے ایک نقطے سے انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہوسکتا...'

کریم بخش کی بات سن کر تھانے دار سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر کو جھٹک کر کہا۔

'اس بات کو ابھی جانے دیں کریم بخش... میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں اور ہمارے پاس پکی خبر ہے کہ... اسلام دہشت گردوں کے ساتھ ہے...'

گویا کریم بخش کے کانوں میں کسی نے کھولتا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ ان کے دماغ کی نسیں پھولنے پچکنے لگیں۔

'اسلام اور دہشت گرد...؟ یہ نہیں ہوسکتا... یہ ہرگز نہیں...'

'لیکن یہی سچ ہے... کریم صاحب... میں ذاتی طور پر آپ کی بے حد عزت کرتا

ہوں...لیکن میں اپنی ڈیوٹی کررہاہوں...آپ سے گزارش ہے، تھانہ کی اجازت کے بغیر آپ شہر سے باہر نہیں جائیں گے...' تھانے دار نے چپ ہو کر ادھر ادھر دیکھا، پھر اس نے پوچھا۔

'ویسے آج...آپ کے طالب علم نہیں نظر آرہے ہیں...؟'

کریم بخش نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس طرح کھڑے رہے، گویا کاٹھ کی مورت ہوں۔ان کی آنکھوں میں خلا بھرا ہوا تھا اور دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

کمرے میں رات کی تاریکی مسلط تھی۔چارپائی پر پڑے کریم بخش کی آنکھیں چھت سے ٹکی ہوئی تھیں۔اندھیرے میں نہ جانے کیا تلاش رہے تھے۔صبح دماغ میں جو آندھیاں اٹھی تھیں، وہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔سائیں سائیں کرتا ایک طوفان اُن کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لیتا جارہا تھا۔

اندر کے کمرے میں ثانیہ تھی۔سو رہی تھی۔نہیں، جاگ رہی تھی۔جاگ ہی رہی ہوگی...صبح تھانے دار کے جانے کے بعد جو پہلا چہرہ سامنے آیا تھا، سوال بن کر...وہ ثانیہ کا تھا...کیا بھائی جان...'بیٹی کا یہ سوال اندر تک نشتر کی طرح اتر گیا تھا۔کوئی جواب نہیں سوجھا تھا کریم بخش کو۔

ایک یہی نہیں، جانے کتنے سوال تھے جو کریم بخش کے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔کیوں...کیوں...کس لیے...؟ لاکھ کوشش کے باوجود انھیں ان سوالوں کے جواب نہیں مل رہے تھے۔

اسلام دہشت گرد...اسلام....

اچانک کریم بخش کی آنکھوں کے سامنے کمہار کی چاک کی طرح جانے کیا کیا گھومنے لگا...

آتنک...دہشت...ورلڈ ٹریڈ سینٹر...اکشر دھام...گودھرا...سنسد بھون...جے پور

...احمد آباد...کشمیر...بچے...بوڑھے...عورتیں...چیخ پکار...فلسطین...اسرائیل..پاکستان...
افغانستان...عراق...امریکہ امریکہ امریکہ...

دماغ کی رگیں تیزی سے پھولنے پچکنے لگیں۔ یک لخت اٹھ کر بیٹھ گئے کریم
بخش۔ پسینے سے ان کا پورا جسم تر بہ تر ہو رہا تھا۔دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا سینہ بار بار
حلق میں آ کر پھنس رہا تھا۔خود کو قابو میں کرتے ہوئے کریم بخش نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ابھی
ڈھائی بج رہے تھے۔اٹھ کر انھوں نے پانی پیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئے۔لیٹتے ہی آنکھوں
میں تھانے دار کا چہرہ...اپنی ڈیوٹی...مزاج بدلا بدلا سا...ڈیوٹی...؟میری عمر...میری عزت
...میرا سماجی کردار...کچھ نہیں...؟نہیں یہ سچ نہیں ہے...کریم بخش یہی سچ ہے...یہی سچ
ہے...اسلام دہشت گرد...

میرے بیٹے...کیا کمی رہ گئی تھی میری پرورش میں...؟روشن...روشن...کہاں ہو تم؟
تمہارے بعد تمہارے بچوں کو باپ تو باپ، ماں بن کر بھی میں نے پالا...اپنے ہاتھوں سے
انھیں تعلیم و تربیت دی...انسانیت کی...بھائی چارہ اور محبت کی...اللہ اور اس کے پیغمبر ﷺ کا
راستہ دکھایا...ان کی باتوں پر عمل کرنا سکھایا...پھر کہاں کمی رہ گئی...؟میری دی ہوئی تعلیم سے
تو انسانیت کے خدمت گار پیدا ہوئے ہیں...گھر گھر میں بھائی چارہ کا پیغام پہنچانے والے
ہوئے ہیں...پھر ہمارا ہی بیٹا...کیسے...کیسے....؟

کریم بخش کو آہٹ محسوس ہوئی۔

ثانیہ تھی۔پر چھائیں بنی دروازے پر کھڑی تھی۔

ابو...بس اتنا بول سکی اور گویا باندھ ٹوٹ گیا۔پھپھک کر رولائی باہر نکل پڑی۔ذرا
دیر میں ہی پورا کمرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

صبح ہوئی لیکن اور دنوں کی بہ نسبت کافی تھکی ماندی سی۔طالب علموں کو سبق
دے کر کریم بخش فارغ ہوئے ہی تھے کہ تھانے دار پورے عملے کے ساتھ گھر کے اندر

گھس آیا تھا۔

'کونا کونا چھان مارو...'

غیر متوقع طور پر رونما ہونے والے اس واقعے کا کریم بخش کو گماں تک نہ تھا۔ایک دم سے پریشان ہو اٹھے، ہکا بکا تھانے دار کا منہ تکنے لگے...'یہ...یہ کیا...؟'

'اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں...آپ مجھے میرا کام کرنے دیں...'

کریم بخش بھاگے بھاگے بیٹی کے کمرے میں گئے۔وہ ایک کنارے دبکی سسک رہی تھی۔پولیس والے سامان کو الٹ پلٹ، بکھیر کر نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔کریم بخش نے بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

'صبر سے کام لو میری بچی...'باہر کے کمرے میں تھانے دار سہمے ہوئے ایک ایک طالب علم کی تلاشی لے رہا تھا۔

'کیا پڑھ رہے ہو...'

'مذہب کے معاملے میں زبردستی نہیں...'

تھانے دار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

....

کہتے ہیں، جنگل کی آگ تیزی سے پھیلتی ہے۔کریم بخش کے ساتھ رونما ہونے والے واقعے کی آگ بھی اس تیزی سے پھیلی کہ محلّہ...شہر...بچہ بچہ جان گیا...کریم بخش کے گھر میں آتنکی تعلیم دی جاتی ہے...دہشت گردوں کو پناہ دی جاتی ہے...پولیس نے آتنکی لٹریچر برآمد کیا ہے...اس کا بیٹا...اسلام...دہشت گرد...

جتنے منھ اتنی باتیں...کریم بخش کی سماجی پہچان کی دھجیاں اڑ گئیں...بتاؤ...اوپر سے دیوتا...اندر سے شیطان...داڑھی کے پیچھے چھپا دیش دروہی...انھیں دیش سماج سے کیا لینا دینا...انھیں تو بس اپنا مذہب...جانے کیسا فتور...جنون...جانے کیسا پاگل پن...صرف

اپنا مذہب... پوری دھرتی پر اکھنڈ راج...اکھنڈ ستا...مارو... کاٹو... خون کھرابا... وسپھوٹ...لاش لاش...چیتھڑے... چیخ...نوحہ...فخر سے ذمہ داری قبول کرتا بیٹا۔

'ن... ہیں...وہ اسلام نہیں ہو سکتا...وہ اسلام...' کریم بخش کو نہ جانے کیا ہوا، چوراہے پر چیخنے لگے۔

کریم بخش کو حراست میں لے لیا گیا۔ پولیس کو یقین تھا، کریم بخش اسلام کے بارے میں جانتا ہے...شاید بہت کچھ...

'آپ اسلام کے بارے میں کیا جانتے ہیں...؟'

'سب کچھ...'

'کیا یہ بھی، اسلام آتنک کا دوسرا نام ہے...؟'

'یہ سچ نہیں ہے...میں اسلام کو اچھی طرح...وہ تو ایک سازش...'

'کیسی سازش...؟ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا...؟ فیروز نگر اسپتال میں وسپھوٹ ... سینکڑوں لوگ مارے گئے...بچے...عورت... بوڑھے...وشنو گڑھ چوراہا پر اے۔ کے۔ 47 سے فائرنگ ...درجنوں مارے گئے...بے قصور... بے گناہ...چکرا گنج اسکولی بس میں وسپھوٹ...درجنوں معصوم پھول بننے سے قبل ہی ...سندر دھام مندر میں وسپھوٹ...کئی شردھالو ہلاک...درجنوں واقعات..سیکڑوں بے گناہوں کی بلی...اور آپ کہتے ہیں اسلام سازش کا شکار...؟ اسلام وحشی ہے ...دراصل انسانیت کا دشمن...جو بے گناہوں کا خون بہائے...جو نہتوں پر وار کرے...جو چھپ کر گھات کرے...'

'وہ اسلام نہیں ہو سکتا...اسلام ایسا نہیں کر سکتا...'

یقین کے مضبوط آہنی قلعے میں تبدیل کریم بخش کو دیکھ کر تھانے دار کا اپنا یقین ڈگمگاتا ہوا لگا۔ نہ جانے کیا تھا، کریم بخش کی آنکھوں میں کہ اس کی اپنی آنکھیں جھک گئیں۔

....

اچانک شہر لرز اٹھا۔ بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں ایک کے بعد دیگرے دھماکے ...لوگوں کے چیتھڑے ہوا میں اڑنے لگے۔ چیخ و پکار...افراتفری سے ماحول کانپ اٹھا۔ ہر طرف انسانی جسم کی دھجیاں اور انسانی خون کی کسیلی گندھ...

حفاظتی دستوں سے مٹ بھیڑ میں ایک دہشت گرد مارا گیا۔ دہشت گرد کی لاش بیچ سڑک پر پڑی تھی۔

'چلیے کریم بخش...شناخت کیجیے...' تھانے دار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔' اس نے ابھی ابھی...چالیس بے گناہوں کو...کیا اب بھی آپ کہیں گے...اسلام ایسا نہیں ہوسکتا...اسلام ایسا نہیں کرسکتا...؟'

کریم بخش نے لاش کو دیکھا۔

'ہاں...میں اسے پہچانتا ہوں...یہ میرا بیٹا تھا، لیکن...' کریم بخش یقین کے اسی مضبوط، آہنی قلعے میں تبدیل کھڑے تھے۔' لیکن...یہ اسلام نہیں ہے...یہ...یہ...'

OO

۔راشٹریہ سہارا، نئی دہلی شمارہ مارچ ۲۰۰۹
۔جن ستا، کولکاتا (ہندی) سالنامہ ۲۰۰۸

سیڑھیاں

صغیر رحمانی

سیڑھیاں

چودھری شجاعت حسین نے سلام پھیرا تو انہیں اپنے شانے پر سفید رنگ کے برادے کی تہہ نظر آئی۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے گردن اٹھا کر مسجد کی چھت کو دیکھا۔چھت کا مادہ بوسیدہ ہو چکا تھا اور اس سے چونے گارے کا برادہ بھربھر کر کے ان کے سر اور کندھوں کے اوپر گر رہا تھا۔انہوں نے کندھے پر صافہ پھیر کر برادے کی تہہ صاف کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔اس مسجد کا نام امینہ مسجد تھا جسے ان کے والد بزرگوار چودھری عنایت حسین نے امینہ بائی کے نام پر بنوائی تھی اور اس میں عبادت کا حق صرف چودھری خاندان کو حاصل تھا۔

جن لوگوں نے چودھری عنایت حسین کا دوردورہ دیکھا سنا ہے، وہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ان کی حویلی کے اوپر سے پرندے نہیں گزرا کرتے تھے۔انگریزوں کی سرپرستی میں یہ گھرانہ ہتھیلیوں پر سورج اگایا کرتا تھا۔ملکیت اتنی بڑی کہ ایک پورے دن میں گھوڑوں کے سم اس کی چوہدی نہیں ماپ سکتے تھے۔کہتے ہیں آج کا یہ شہر نصف سے زاید ان کی رعیت میں ہی بسا ہوا ہے۔شہر کے کئی محلوں، چوک چوراہوں اور بازاروں کے نام اس گھرانے کے پرانے لوگوں کے ہی نام پر رکھے گئے ہیں۔لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ عنایت پور گاؤں کی اس حویلی میں کبھی شام نہیں ہوتی تھی۔ دن ڈھلتے ہی حویلی کے طاق چراغاں ہو اُٹھتے تھے اور محرابوں سے گھونگھروؤں کی آوازیں ٹکرانے لگتی تھیں۔ چودھری عنایت حسین خواہ دن بھر زمینداری کے کاموں میں مصروف رہیں، انھیں سکون ملتا تھا شام کی محفل سے ہی جب امینہ بائی کا طاؤسی رقص پیش ہوتا تھا۔امینہ بائی جب جنگل کے مور کی طرح اپنے خاص انداز میں رقصاں ہوتی تھی

تو چودھری عنایت حسین کا دل اچھل کر فرش پر آ گرتا تھا جسے امینہ بائی بڑے ناز و ادا سے اپنی ہتھیلیوں میں اٹھایا کرتی تھی اور واپس چودھری عنایت حسین کے قلب میں رکھ دیتی تھی۔

'سنبھال کر رکھیے حضور، زخمی ہو جائے گا۔'

کہتے ہیں، کہاں سنبھلتا تھا ان سے ان کا بے تاب دل۔ ان کا اشارہ پا کر محفل سے کارندے سازندے اٹھ جایا کرتے تھے، ایوان خالی ہو جاتا تھا اور چودھری عنایت حسین کا اشارۂ مکرر پا کر امینہ بائی ان کے سامنے اس موری پر بیٹھ کر جو ایک کونے میں خاص طور پر اس کے لیے ہی بنائی گئی تھی، پانی چھوڑا کرتی تھی۔ اس وقفے اس کے اس عمل سے جو ایک خاص طرح کی موسیقی پیدا ہوتی تھی، کہتے ہیں، اس موسیقی سے چودھری عنایت حسین اتنے مسرور و محظوظ ہوا کرتے تھے کہ علاقہ کا علاقہ اس کے نام کر دیا کرتے تھے۔

پھر وقت نے کروٹ لیا۔ آزادی حاصل ہوئی۔ ملک تقسیم ہوا اور ملک کے ساتھ چودھری خاندان بھی تقسیم ہو گیا۔ پاکستان جنت سریکھا لگا، زیادہ تر لوگ پاکستان چلے گئے لیکن چودھری عنایت حسین اپنے بیوی بچے کے ساتھ یہیں بنے رہے کہ یہاں بنے رہنے کے پیچھے کئی وجوہات میں ایک وجہ بذات خود امینہ بائی بھی تھی۔ حتیٰ کہ بعد میں جب زمینداری جاتی رہی اور امینہ بائی بھی دق کی مریضہ ہو کر مر گئی تو انھیں افسوس ضرور ہوا کہ انھیں بھی پاکستان چلے جانا تھا۔ کچھ بھی ہو، تقریباً پورا خاندان تو چلا ہی گیا تھا۔ کسی طرح انھوں نے امینہ بائی کے نام پر ایک مسجد بنوانے پر اکتفا کیا۔ لوگوں کی مانیں تو وہ امینہ بائی سے بے انتہا محبت کرتے تھے بلکہ امینہ بائی ایک ایسا بے کراں سمندر تھی جس میں چودھری عنایت حسین نام کا جہاز ڈوب گیا تھا۔

وقت کی خوبصورتی اس میں ہے کہ وہ ایک سا نہیں رہتا۔ جس حویلی کی مینار پر سورج آویزاں رہتا تھا اب وہاں چراغ کے تیل بھی کم پڑ گئے تھے۔ قلیل مقدار میں بچے رہ

گئے۔کھیتوں اورآم کے باغیچوں سے جوسالانہ مال گزاری حاصل ہوتی تھی اس سے سال میں ایک بار شب بارات کے موقع پر طاقوں میں اگ آئی جھاڑ پھوس کے جنگلوں کوصاف کیا جاتا تھا، فاتحہ خوانی کرائی جاتی تھی اور پوری حویلی میں اگربتی اور لوبان کی خوشبو پھیلا دی جاتی تھی اس خیال کے تحت کہ آباؤاجداد کی روحوں کوسکون پہنچے کہ خواہ کچھ بھی ہو، بچا کھچا ان کے نام سے ہی تو تھا 'چودھری خاندان'۔

مسجد سے لوٹتے ہوئے چودھری شجاعت حسین حسب معمول سلیم خان کی پان دکان پر ذرا دیر ٹھہرتے، ایک گلوری بندھواتے، پورے انہماک کے ساتھ اول تا آخر اخبار کے صفحات کا معائنہ کرتے، گہری سانسیں خارج کرتے اور گھر کی جانب بڑھ جاتے۔

چودھری شجاعت حسین گھر آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گئے تھے۔ ذرا دیر بعد رخسانہ چائے کی پیالی لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔اس نے پاس والی میز پر پیالی رکھ دی اور کھڑی ہوگئی۔ چودھری شجاعت حسین نے گردن اٹھا کر دیکھا، بیٹی کی غریب جوانی سر جھکائے کھڑی تھی۔انہوں نے غور سے رخسانہ کو یکھا۔اس کے چہرے کی جھریاں جگہ جگہ سے نمایاں ہو رہی تھیں۔آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اندھے کنویں کی مانند اور بالوں میں سفیدی کے تار کسی بوسیدہ عمارت پر ٹمٹماتے قمقمے سریکھے جان پڑتے تھے۔انہوں نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔وہ کافی دیر تک نگاہیں جھکائے بیٹھے رہے۔

'تو کیا سوچا آپ نے؟'

اس آواز پر انہوں نے گردن اٹھائی۔انہیں علم بھی نہیں ہوا کہ کب رخسانہ رخصت ہوئی اور اس کی جگہ ان کی بیوی زرینہ بی آ کھڑی ہوئیں۔زرینہ بی سراپا سوال بنی ہوئی تھیں۔چودھری شجاعت حسین بخوبی سمجھ رہے تھے کہ ان کی بیوی کیا پوچھ رہی ہے پھر بھی وہ خاموش رہے۔ذرا دیر بعد زرینہ بی کی آواز دوبارہ ان کے کانوں میں گئی۔

'رخسانہ پینتیس کی ہو رہی ہے۔'

چودھری شجاعت حسین نے اضطراب میں پہلو بدل لیا۔ رخسانہ پینتیس کی ہو رہی ہے، یہ اطلاع خرمن پر بجلی گرنے جیسی ہی تھی۔ حتیٰ کہ ایسا نہیں تھا کہ رخسانہ کی عمر کوئی راز تھی اور وہ پہلی بار اُن پر افشا ہو رہی ہو بلکہ اس کے ڈھلتے سورج کی مدھم روشنی ان پر کئی دفعہ پڑی، اور نہ صرف رخسانہ کی بلکہ اس کے بعد والی بتیس سالہ جوہر کی عمر بھی ان کی رات کی نیندوں پر برچھی بھالا جیسے نوکیلے احساس کے ساتھ مسلط رہا کرتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، ان دونوں کے بعد والے چودھری معرفت حسین کے احوال بھی کم تشویش ناک نہیں تھے۔ وہ تیس سال کی دہلیز پر آن کھڑے ہوئے تھے اور ان کی سرکاری افسر بننے کی عمر بس گزر ہی جانے والی تھی۔

چودھری شجاعت حسین کو اچھی طرح یاد ہے، جب ان کے رشتے کی بات چلی تھی، قرب و جوار کا شاید ہی کوئی اعلیٰ گھرانا تھا جس نے ان کی چوکھٹ پر سینی پیش نہ کی ہو۔ ہر خاندان اس چودھری خاندان سے نسبت کرنے کی تگ و دو میں کوشاں تھا اور چہار جانب سے اپنی حیثیت کا ثبوت پیش کروایا کرتا تھا اور چودھری شجاعت حسین بڑی حقارت سے ان رشتوں کو ٹھکرا دیا کرتے تھے کہ قد میں ان گھرانوں کی مینار یں ان کے خاندان کی میناروں سے بونا ہوا کرتی تھیں اور چودھری شجاعت حسین کو یہ تضحیک کسی قدر منظور نہ تھی۔ قاسم پور کی زرینہ بی کا گھرانہ واقعی عنایت پور کی حویلی کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونے کا مزاج تھا لہٰذا زرینہ بی دلہن بن کر آ گئی تھیں۔

زمانے کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اچھے، خوب صورت وقتوں کی قدر کرتا ہے۔ عنایت پور کی اس حویلی کی مینار یں بظاہر اَب بھی بلند قامت دکھنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن زمانے کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ گیا تھا کہ اس کا مادہ بوسیدہ ہو چکا ہے، بس اس کے زمیں بوس ہونے بھر کی جو دیر ہو۔ علاقے کے دیگر باوقار خاندانوں کی بات تو جانے دیں اپنے

خاندان کے بچے کھچوں نے بھی انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا۔

اور رخسانہ پینتیس کی ہوآئی۔

زرینہ بی استادہ تھیں اوران کا سوال بھی استادہ تھا۔

'لڑکا اچھا ہے...'

'اور خاندان؟'

'.................'

یہ کیسے ممکن تھا؟ دنیا الٹ پلٹ ہوسکتی ہے، زمین آسمان ایک ہو سکتے ہیں مگر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

'ناممکن'

انتہائی ضبط کے ساتھ چودھری شجاعت حسین کے پاس اپنی بیوی زرینہ بی کے سوال کا اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا۔ ذرا دیر سر جھکائے کھڑا رہنے کے بعد زرینہ بی افسردگی کی چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ وہ ماں تھیں تو چودھری شجاعت حسین بھی باپ تھے۔ انہیں زرینہ بی کی افسردگی کا خاطر خواہ احساس تھا مگر اپنی درجاتی اور طبقاتی فصیل کو عبور کرنا انہیں قطعی منظور نہ تھا۔ فی الوقت ان سارے مسئلوں کا حل انہیں اپنے فرزند باکمال چودھری معرفت حسین میں نظر آ رہا تھا۔ انھیں پورا یقین تھا کہ صرف چودھری معرفت حسین ہی چودھری خاندان کی اس ڈوبتی نیّا کو کنارے تک پہنچا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری امیدیں ان سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ اللہ اللہ کر کے بس وہ افسر بن جائیں۔ وہ حتمی طور پر ایسا سمجھتے تھے کہ عہدہ، رتبہ اور آمدنی کا راستہ ہموار ہوتے ہی تمام مسئلوں کا حل خود بہ خود نکل آئے گا۔ چودھری معرفت حسین نے بھی رات رات اور دن دن ایک کر کے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاریاں کی تھیں۔ انھوں نے افسر بننے کا امتحان دے رکھا تھا اور

اب بس اس کے نتیجے آنے ہی والے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں اتنی اہلیت تو تھی ہی کہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت انہیں کب کی مل جاتی مگر وہ چودھری خاندان کی شایان شان کہاں ٹھہرتی۔

چودھری شجاعت حسین کا زیادہ تر وقت اپنی مسجد میں گزرتا۔ اللہ کی بارگاہ میں سر جھکاتے اور چودھری معرفت حسین کی کامیابی کی دعا مانگتے۔ واپسی میں سلیم پان دکان والے کے یہاں نتیجے کی امید میں اخبار کھنگالتے۔ ہر روز اخبار دیکھتے، ہر روز مایوس ہوتے۔

ایک دن اللہ نے ان کی سن لی۔ نتیجے شایع ہو گئے مگر ان نتیجوں میں ان کے فرزند چودھری معرفت حسین کا نام کہیں نہیں تھا۔ انہوں نے ایک بار نہیں، دو بار دیکھا، کئی بار دیکھا۔ چودھری معرفت حسین کا نام کہیں نہیں تھا۔ ان کے اندرون میں کچھ ٹوٹ گیا۔ انہیں محسوس ہوا گویا پیروں میں جان باقی نہ رہی۔ اس سے قبل کہ وہ کٹے ہوئے درخت کی مانند گر پڑتے، کسی طرح گھر پہنچے۔ زرینہ بی نے پانی پلایا تو حواس ذرا بحال ہوئے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والے نے ادب سے سلام پیش کیا۔ چودھری شجاعت حسین نے ذرا سی کوشش سے پہچان لیا۔ گاؤں کے ہی رتّو جلاہے کا بیٹا انور تھا۔ مٹھائی لے کر آیا تھا۔ دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ افسر بن گیا تھا۔ چودھری شجاعت حسین کو جیسے اپنی ہی سنی پر یقین نہیں ہو رہا تھا، اپنی ہی دیکھی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی بساہٹ میں جس کا خاندان بسا ہوا ہے۔ وہ خاندان جس نے اس حویلی کے روشن دان سے چھن کر آتی روشنی مستعار لے کر تعلیم حاصل کی۔ آج اس نے چودھری خاندان کو آخر کس بنا پر شکست دی تھی؟

جلد ہی یہ معمہ بھی حل ہو گیا کہ اس کی کامیابی میں اس کی محنت اور اہلیت کے علاوہ حکومت کی ریزرویشن پالیسی نے اہم کردار ادا کی ہے۔ اس اطلاع سے نہ جانے کیوں چودھری شجاعت حسین کو محسوس ہوا کہ ان کے اندر کا قلق قدرے کم ہو گیا ہے۔

....

چودھری شجاعت حسین وقت کی سیڑھیوں پر کھڑے ہیں۔ سیڑھیوں کی خوب صورتی ہوتی ہے کہ وہ بلندی کو چومتی ہیں اور پستی کو بھی۔

صاف صفائی اور مرمت کے بعد حویلی کو رنگ روغن کیا گیا ہے۔ چودھری معرفت حسین افسر بن گئے ہیں۔ یہ سب بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل ہوا ہے۔ سب کچھ تو انہیں کے نام سے ہے۔ انہیں سکون پہنچایا جا رہا ہے۔ پوری حویلی اگر بتی اور لوبان کی خوشبو سے نہائی ہوئی ہے۔ فاتحہ خوانی کی جا رہی ہے۔ چودھری شجاعت حسین اور چودھری معرفت حسین فاتحہ میں شریک ہیں۔

...اور یہ صرف وہی دونوں جانتے ہیں کہ یہ فاتحہ بزرگوں کے لیے نہیں پڑھی جا رہی۔

OO

راوی، شمارہ ۱، جمشید پور

میں، وہ اور جھانوی

صغیر رحمانی

میں، وہ اور جہانوی

الارم کی گھنٹی بجتی ہے اور میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ صبح کے ٹھیک پانچ بجے ہیں۔ ہلکی سردیوں کے دن۔ کمرے کا ماحول ہلکا گرم اور ہلکا نشیلا۔ بستر چھوڑنے کی رتی برابر خواہش نہیں ہو رہی ہے۔ صبح کا بستر کچھ زیادہ ہی راس آتا ہے بدن کو۔ اس کے ہاتھوں کی نرم اور سبک تھپکیاں میرے جاگے ہوئے بدن کا جتن کرتی ہیں۔ جسم کے پور پور میں اُداس رات کا خمار بھرا ہوا ہے۔ جیسے میری پلکوں پر کوئی اپنی ہتھیلی کے چھور سے پنکھے رکھ رہا ہو۔ کھلنے کا نام نہیں لے رہیں۔ ہٹھیلے بچے کی طرح کروٹ بدل کر سیدھی لیٹ جاتی ہوں۔ چادر میں لپٹے بدن کو اینٹھتی ہوں۔ درد، مایوسی اور تھکان سے بھری اندر کی گانٹھیں پٹ پٹ کھلنے لگتی ہیں۔ صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ۔ بارہ بجے تک مشین بنی میں ترومہتا، جب بستر پر گرتی ہوں تو نیند میں بھی سب کچھ اوپر تلے ہوتا محسوس کرتی ہوں۔

کھلتی بند ہوتی آنکھوں کو زور لگا کر کھلا رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ دماغ میں جیسے خلا سا بھرا ہے۔ گردن گھماتی ہوں، دیکھتی ہوں، باپ بیٹی گہری نیند میں ہیں۔ رات میں ٹی وی پر 'پرفیکٹ برائڈ' پروگرام دیکھتے دیکھتے جو سوئے ہیں تو الارم کی گھنٹی بھی انہیں نہیں جگا سکی ہے۔ ویسے بھی جس چیز کا، جس کسی سے سیدھا تعلق ہوتا ہے، وہ اسے ہی متاثر کرتی ہے۔ گھڑی کے الارم کا تعلق مجھ سے ہے، اس لیے صرف میں ہی متاثر ہوتی ہوں۔ اس کی سخت آواز صرف مجھے ہی جگاتی ہے۔

آرو پیارا لگ رہا ہے۔ سوتے ہوئے وہ اکثر پرکشش لگتا ہے اور ہمیشہ ہی کھینچتا ہے اپنی طرف۔ اسے دیکھتے ہوئے لمبی سانس کھینچتی ہوں، اس کے بارے میں سوچتے

ہوئے لمبی سانس کھینچتی ہوں۔ خود کو دیکھتے ہوئے، خود کے بارے میں سوچتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں کھینچتی ہوں۔ جو تاثر پیدا ہو رہا ہے، وہ تأسف کا نہیں ہے۔ نہ اپنے لیے، نہ اس کے لیے۔ ہمدردی کا ہے۔ اپنے لیے بھی، اس کے لیے بھی۔

دونوں کی نیچے تک سرک آئی چادر کو ٹھیک کر کے بستر سے نیچے آجاتی ہوں۔ پورے کھلے منہ والی جمائی لیتی ہوں اور کچن کی طرف بڑھ جاتی ہوں۔

ساسپین میں چائے کھول رہی ہے۔ پورا کھولاتی ہوں، رنگ گاڑھا اور سواد تیکھا ہونے تک۔ پیالے میں چائے انڈیل کر باتھ روم میں گھس جاتی ہوں۔ برش کرنے کے بعد فوراً میرے ہونٹوں کو گرم پیالے کی تپش محسوس ہونی چاہیے۔ ذرا سی بھی دیر ہوئی، پورا دن سُست ہو جاتا ہے میرا۔

چائے کا پہلا گھونٹ، پوری رات کی غنودگی اور جمود کو تحلیل کر دیتا ہے۔ رگوں میں حرارت دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ خون کی گردش تیز ہوتے ہی دل و دماغ فعال ہونے لگتے ہیں... اور ساتھ ہی میں بھی حرکت میں آجاتی ہوں۔

آرو کو آٹھ بجے آفس کے لیے نکلنا ہوتا ہے۔ میں نو بجے نکلتی ہوں۔ جھانوی کا اسکول بھی نو بجے سے ہے۔ اسے اسکول چھوڑتے ہوئے میں آفس چلی جاتی ہوں۔ اس سے پہلے سب کے لیے بریک فاسٹ اور سب کے لیے لنچ۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا۔ باہر کا کھانا سب کے لیے منع ہے۔ باہر کا کھانا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا۔

میں نے سبزی چڑھا دی ہے۔ آلو اور مٹر کی۔ آرو کو اچھی لگتی ہے۔ جھانوی بھی کھا لیتی ہے۔ بس تھوڑی تیکھی کم ہونی چاہیے۔ ناشتے میں بریڈ پکوڑا، بریڈ بٹر یا آلو کے پراٹھے۔ کچھ میٹھا، گاجر کا حلوہ یا کھیر وغیرہ ہو تو مزہ آجاتا ہے باپ بیٹی کو، اور شاید مجھے بھی۔ اس طرح کی جھنجھٹ والی چیزیں رات میں ہی بنا کر فریج میں ڈال دیتی ہوں۔ صبح میں وقت اتنا کم ملتا ہے کہ سبزی وغیرہ بھی رات میں ہی کاٹ چھیل کے رکھ لیتی ہوں۔

آرو سات بجے سو کر اٹھتا ہے۔ جب تک وہ تیار ہوتا ہے، میں اس کا بریک فاسٹ اور لنچ باکس تیار کر دیتی ہوں۔ اس کے آفس جانے کے بعد اسکول کے لیے جہانوی کو تیار کرنے میں لگ جاتی ہوں۔ جہانوی کو تیار کرنا اور اسے ناشتہ کرانا اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہوتا ہے۔ اسے کچھ کھلانا تو اتنا مشکل کام ہے کہ... آلو پراٹھا بنا ہو تو کسی اور چیز کے بنانے پر اصرار کرے گی۔ پوہا بناؤ تو کارن فلیکس کے لیے مچل اٹھے گی۔

نو بجے بوا آجاتی ہیں۔ شام تک گھر میں رہتی ہیں۔ اس درمیان دو بجے جہانوی کو اسکول سے لے آتی ہیں۔ لاکھ کوشش کرتی ہوں، وقت پر سب کچھ نپٹالوں پر رات کی مایوسی ...صبح میں افراتفری مچ ہی جاتی ہے۔ اپنے لیے تو کچھ کر ہی نہیں پاتی۔ بس جلدی جلدی بال وال سمیٹے، چہرے پر کچھ لیپا پوتی کی اور دوڑ پڑے۔ آفس میں سندھیا کئی بار ٹوک چکی ہے۔ ''یار ترو، کچھ اپنا بھی کیئر ویئر کیا کر۔ بستر سے اٹھ کر سیدھی آفس آجاتی ہو۔ کچھ بھی ہو... یہاں پبلک ڈلنگس ہوتی ہے یار...'' شکر ہے، آنند جی کبھی ٹوکا ٹا کی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں، ''عورت ہر روپ میں اچھی لگتی ہے۔ بس اسے دیکھنے والی نظر ہونی چاہیے...'' لیکن آرو... خود کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی ہوں میں....

شام کو آفس سے آتے ہی میں چھت پر آگئی ہوں۔ شاید، یہی کچھ پل میرے ہوتے ہیں۔ شاید ان ہی کچھ ساعتوں کو میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔ جب میرے آس پاس کوئی نہیں ہوتا، جب میں کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ میں صرف اپنے اندر ہوتی ہوں۔ اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوتی ہوں، اپنے کو سن رہی ہوتی ہوں، محسوس کر رہی ہوتی ہوں۔

مغرب کی جانب آسمان کا رنگ سندوریا ہو رہا ہے۔ پورے دن کے سفر سے تھکا تھکا سورج... ڈوبتا سورج، طویل و عریض فلک کے اگلے حصے پر اس طرح آویزاں ہے جیسے کسی چوڑی پیشانی والی بنگالن عورت نے چھوٹی سی سرخ بندی ماتھے پر چپکالی ہو۔

میرے اندر کچھ کھلنے لگا۔ کئی کئی کھڑکیاں، کئی کئی دروازے۔ میں ہر کھڑکی، ہر

دروازہ سے باہر نکلنے لگی ہوں۔اڑنے لگی ہوں، لامتناہی افق پر اڑ رہی ہوں، اڑتی ہی جا رہی ہوں۔

بوا چائے دے گئی ہیں۔

آسمان جہاں جھکا ہے، ناریل پیڑوں کی جھرمٹ میں، وہاں سے وہ آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا ہے۔ میں ایک اور ہی منظر کو اپنی طرف جست لگا کر آتا دیکھتی ہوں۔سات سال قبل ایسی ہی ایک شام... اودھ کی شام، جب میں کالج ٹرپ پر تھی، آرو سے ملاقات ہوئی تھی۔

چائے کا پہلا گھونٹ۔میں آسودہ ہو رہی ہوں۔سورج کا یہ آخری سفر میرے اندر مسافرت کا سنسار رچ رہا ہے۔آسودگی کا یہ احساس مجھے حرارت اور توانائی سے بھر رہا ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں شاید دل نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا۔آرو کا کوئی تھا نہیں، اسے کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑی۔میری اماں تھی، پتاجی تھے۔مجھے صرف اماں سے فیصلہ کن لہجہ میں کہنا پڑا تھا، ''نا...نو...اگر...مگر...کا ٹریڈیشنل سانگ مجھے نہیں سننا۔''

پتاجی تو ویسے بھی کچھ نہیں بولتے تھے۔اماں کو کچھ بولنا تھا، پر بولیں صرف اتنا ہی، وہی اپنا پرانا تکیہ کلام...ار...رے...کاٹھ کی ہانڈی...۔

ہم نے شادی کر لی تھی۔

فضا شانت ہوتی جا رہی ہے۔تھوڑی دیر میں جیسے سب کچھ ٹھہر جائے گا۔منزل کی طرف بڑھ رہے سورج کے بوجھل قدم اب دکھائی دینے لگے ہیں۔

ڈوبتا سورج اور اس وقت کی خاموشی مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔بچپن سے ہی، ایک عادت سی بن گئی ہے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنا۔آٹھ کلاس تک میں گاؤں میں تھی۔عمر رہی ہوگی، بارہ، تیرہ۔اپنے گاؤں آنے والے راستے میں کھرنجا بچھی سڑک ہوا کرتی تھی

جس کی دونوں طرف دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جن میں برسات کے دنوں میں دھان اور سردیوں میں سرسوں لہراتی تھی۔ درمیان میں سڑک اور کھیتوں سے لگی بیری کی ایک بغیا پڑتی تھی۔ کمیش کے ساتھ بغیا میں گھس کر گلہری اور سگوں کے جھوٹے بیر کھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ گلہری اور سگے انہی بیروں کو کترا کرتے تھے جو میٹھے ہوتے تھے۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ مجھے مدہوش کرتی تھی، وہ تھا میرے گاؤں کے ماتھے پر دمکتا اور ڈوبتا سورج۔ اسکول سے چھوٹنے کے بعد کھرنجا بچھی ہوئی اس لمبی سڑک کی دُوری طے کرتے ہوئے اکثر شام کجرا جایا کرتی تھی اور مٹ میلے، سرمئی دھند لکے کے بیچ سورج ٹھیک میرے گاؤں کے اندر سماتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سندھیا اپنے نام کی طرح سوچتی ہے یا پھر اماّں کی طرح۔ کہتی ہے، ڈوبتا سورج منفی سوچ کی علامت ہے۔ ان سب باتوں کو میں اس لیے نہیں قبول کر سکتی کیوں کہ منفی مثبت میں مجھے یقین نہیں ہوتا۔ ایسی چیزوں کو تسلیم کرنے میں مجھے ہمیشہ تردد ہوتا اور اگر سندھیا درست بھی ہے، تو بھی... میرے ساتھ کا معاملہ تو بالکل اس کے برعکس ہے۔

بچپن کا وہ ڈوبتا سورج' صرف ایک سورج نہیں تھا۔ گہری خاموشی اور سناّٹوں کے بیچ اس ڈوبتے سورج نے میری سوچ، میرے خیالوں کو پر دیے، اڑان دی۔ اس نے اس حسِ باطنی کو جھنجھوڑا جسے میں جانتی تک نہیں تھی اور اس نے میرے ادراک کو جلا بخشی۔ میرے اندر کویتا، کہانی، سنگیت، رنگ نہ جانے کیا کیا پیدا کیے۔ جیسے اس ڈوبتے سورج نے مجھ سے میرا تعارف کرایا، میری پہچان کرائی۔ میں نے دیکھا، میں جتنی باہر تھی، اس سے کہیں زیادہ اپنے اندر تھی۔

جس دن اسکول نہیں جانا ہوتا یا چھٹیاں ہوتیں، میں کمیش کو پکڑ کھرنجا بچھی اس سڑک پر نکل جاتی۔ گہری خاموشی میں ڈوبتے سورج کو دیکھتی۔ اماّں کو میرا بدلا ہوا رویہ، میری بولی بانی اچھی نہ لگتی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی تو بہت تھیں پر بول پاتی تھیں صرف اتنا

ہی..ار...رے...کاٹھ کی ہانڈی...۔

آگے کی پڑھائی شہر میں ہوئی۔ پتا جی کا شہر میں ٹھیکہ داری کا کام چل نکلا۔انہوں نے گاؤں کی کھیتی باڑی بیچ باچ کر شہر میں مکان بنوالیا۔ اونچے اونچے پکّے مکانوں کے پیچھے،سورج یہاں بھی ڈوبتا تھا۔

بوا گرم شال رکھ گئی ہیں بدن پر۔شہر گاؤں سے کتنا پیچھے ہے،اس کا اندازہ سندھیا سے ملنے کے بعد ہوا۔آفس کا لنچ اسی کی سنگت میں ہوتا۔

''کچھ چیزوں، کچھ قدروں کو ہم خود سے الگ نہیں کر سکتے ترومبتا...''

''کیوں نہیں کر سکتے ؟میں یہی جاننا چاہتی ہوں۔ یہی پوچھنا چاہتی ہوں۔کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم خود کچھ قدروں سے رہائی پانے کی کوشش نہیں کرتے۔انہیں نوچ کر پھینک نہیں پاتے...''

''شاید تم یہی سوچ سکتی ہو، جو ٹھیک بھی ہے...''

''سندھیا...سندھیا...''

ناریل کے پیڑوں کی جھرمٹ کے پیچھے سارا منظر شانت ہونے لگا ہے۔سب کچھ ہلکا سرخ، چمکیلے بادامی رنگوں جیسا پھیل گیا ہے۔

آرو اچھا انسان ہے۔گرین انرجی کے علاقے میں کام کرنے والی ایک کمپنی میں کاربن کو کم کرنے والے ریسرچ ورک سے جڑا ہے۔بیک گراؤنڈ انوارمنٹ سائنس ہونے کی وجہ سے کسی بھی چیز کا باریک تجزیہ کرنے والا اور ایک مدلل شخص ہے۔

شادی کے دو سال بعد جہانوی ہوئی تھی۔

دل و دماغ کو ولولوں سے بھر دینے والا لمحہ۔واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے، پہلے ایک چوتھائی، پھر آدھا اور پھر اس کے بعد پورا کا پورا سورج غائب ہو گیا ہے۔ایک عجیب سا، گہرا سکوت۔کوئی ہلچل نہیں۔کوئی شور، کوئی حرکت نہیں۔سب کچھ ایک دم ٹھہرا ہوا۔

میرے اندر بھی سب کچھ شانت، جیسے جوار اٹھنے کے بعد سمندر۔ آسودگی کا عروج، جیسے اب اس کے بعد کچھ بھی نہیں... صرف خلا... خلا... بے رنگ... بے حرکت...

ہمارے جذبات ہمیشہ التفات کے آرزومند رہتے ہیں اور نظر انداز کیے جانے سے مجروح ہوتے ہیں۔ اماں سوتیلی ماں نہیں سگی ماں تھیں مگر کمیش کو تھن سے تازہ نکلا گرم سادودھ دیتی تھیں اور مجھے پانی ملایا ہوا۔ کیوں؟ کیوں کہ بھیا جگ اُجیارا تھا۔ نام ونسب کو روشن رکھنے والا۔

جذبوں کو متواتر نظر انداز کیا جائے تو وہ احتجاج میں شعلہ رو ہو جاتے ہیں۔ پریمی سے، وہ بھی غیر برادری والے پریمی سے شادی بھی شاید ایسے ہی ہتک آمیز حالات کا نتیجہ تھی۔ پریم کو پانا زندگی کا بڑا حاصل ہے لیکن اس کو شاداب رکھنا اس سے بھی بڑا حاصل ہوتا ہے۔ محبت اپنے تقاضے کچھ الگ طرح سے تراشتی ہے۔

ابھی کچھ دیر میں یہاں چھت پر رہوں گی۔ ہلکا دھندلکا چھانے تک یا پھر آرو کے آفس سے آنے تک۔ اس بیچ ہو سکتا ہے، بوا سے ایک پیالا اور چائے کے لیے کہوں یا پھر وہ خود ہی دے جائیں۔

آرو کی چھت پر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں سورج ناریل کے پیڑوں کی جھرمٹ کے پیچھے ڈوبتا ہے۔ جس طرح گاؤں میں ڈوبتا تھا، جس طرح ہمارے شہر والے نئے مکان میں ڈوبتا تھا، اس سے کہیں زیادہ دلکشی اور وقار کے ساتھ آرو کی چھت پر ڈوبتا تھا۔

یہ روز کا معمول ہے۔ آفس سے آنے کے بعد میں سیدھی چھت پر آجاتی ہوں۔ اس وقت جہانوی ٹیوشن پڑھ رہی ہوتی ہے۔ آرو سات بجے تک آفس سے لوٹتا ہے۔ پوری رات اپنے آپ سے اور اگلا پورا دن اندھکار بھری مایوسی سے لڑتے گزرتا ہے، اس کے لیے اس مختصر وقفے میں خود کو تیار کرنا ہوتا ہے مجھے۔ بوا یہیں چائے دے جاتی ہیں۔ کبھی کبھی

چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے یا بھجیہ بھی۔ چائے اور پکوڑے کے ساتھ ڈوبتے سورج کو نہارنا...کوئی تصور نہیں کرسکتا، میں کس جہان کی سیر پر نکل جاتی ہوں۔

رات کے سوا گیارہ ہونے والے ہیں۔ جہانوی سوچکی ہے۔آرو جاگ رہا ہے۔ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔آرو کی شرٹ اور جہانوی کا اسکول ڈریس پریس کرنے کے بعد مجھے بھی فرصت مل گئی ہے۔تھکان سے اب کھڑا بھی ہو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ کچن اور باتھ روم کا دروازہ بند کرگرگئی ہوں بستر پر۔

بغل میں جہانوی ہے،اس کے بعد آرو۔ابھی جہاں جہانوی ہے، پہلے وہاں آرو ہوا کرتا تھا۔ جہانوی کے ہونے کے بعد تک آرو کی جگہ نہیں بدلی تھی۔اس کی ایک طرف میں، دوسری طرف جہانوی ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی ایک بانہہ پر میرا سر اور دوسری بانہہ پر جہانوی کا سر ہوتا تھا۔اس کی کروٹ لے کر سونے کی عادت تقریباً چھوٹ گئی تھی۔اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آرو کی پوری دنیا اس کی بانہوں میں ہوتی تھی۔اور میری...تو میری ہی کیا،ایسی راتیں کسی بھی عورت کے لیے زندگی کی عظیم راتیں ہوتی ہیں...

تھکان ہونے کے باوجود نیند نہیں آ رہی۔اٹھتی ہوں، لائٹ آف کرنائٹ بلب جلا دیتی ہوں۔ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی ہے کمرے میں۔

آرو چوڑے سینے اور لمبی بانہوں والا مرد ہے۔میں اس کے سینے تک آپاتی ہوں۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی واضح طور پر سنائی دیتی ہے کہ ایک ایک کرکے گن لوں۔لیکن جب اس کی بانہوں کا دائرہ تنگ ہوتا ہے تو مچھلی کی طرح چھٹپٹانے لگتی ہوں۔ میرا مچھلی کی طرح چھٹپٹانا، اس کے لیے سنسار کا سب سے بڑا سکھ ہوتا ہے۔قہقہہ لگا کر ایسے ہنستا ہے... ہنستا تھا جیسے...

ایک دن اس نے کہا تھا، 'تم موٹی ہوگئی ہو...' اس کے کہنے پر خود کو دیکھا تو دنگ رہ گئی تھی۔ جہانوی کے ہونے کے بعد غیر متوقع طور پر مجھ میں تبدیلی آ گئی تھی۔آگے سے

پیٹ، پیچھے سے کولہوں کی پیمائش بڑھ گئی تھی۔ سچ، اپنی ہی نظر میں بھدّی لگ رہی تھی میں۔ دوسالوں تک جہانوی کو فیڈ ِنگ کرانے کے سبب ڈھیلی بھی ہو گئی تھی...

لوگ کہتے ہیں کہ محبت بے لوث ہوتی ہے۔ اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ محبت وہ جانور ہے، جو جسم کی رسی کے بنا بندھ ہی نہیں سکتا۔ جیسے، میرا جسم اب آرو کو، اس کی محبت کو باندھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا تھا اور مایوسی سے بھرتا جا رہا تھا۔ پھر ایک دن، 'جہانوی آئسولیٹ ہوتی ہے کنارے...' کہہ کر اس نے جہانوی کو بیچ میں کر دیا تھا اور خود کنارے ہو گیا تھا۔

چلو، کوئی بات نہیں... بچّے کو ماں باپ دونوں کی قربت ملنی چاہیے... سوچ کر خود سے ہمدردی دکھائی تھی میں نے۔ اندر ماں تھی اس لیے بیوی کو زیادہ راگ الاپ کا موقع نہیں مل سکا...

ٹی وی دیکھتے دیکھتے آرو سو گیا ہے۔ دیکھ رہی ہوں اسے۔ کتنی معصومیت ہے اس کے چہرہ پر۔ خاص کر اوپر کی جانب اُلٹا ہوا اس کا اوپری ہونٹ بڑا قاتلانہ ہے۔

جسم جب بولتا ہے تو گونگا بنا دیتا ہے، من جب بولتا ہے تو زبان دراز کر دیتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ یاد ہی نہیں، کتنی ہی راتیں بیت گئی تھیں بدن کے کپڑے اتار کر ہمیں ہوسناک ہوئے۔ شاید میری ہی خواہش نہیں جاگی... پر ایا سکھ...

کتنی کوشش تو کی میں نے۔ سنترے کے چھلکے سکھا سکھا کر چھاتیوں پر اس کے پاؤڈر کا لیپ لگایا تاکہ کساؤ آ جائے اور دلکشی بھر جائے... کتنی فاسٹنگ ڈائٹنگ کی کہ تھل تھلاپن دور ہو... پر میرے لیے سب بے کار... نہیں، میرے لیے نہیں، آرو کے لیے۔

وہ اُداس رہنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑا ردِّ عمل دینے لگا تھا اور...

میں نے آرو سے کہا تھا، 'تم چاہو تو کسی سے عشق کر سکتے ہو، تمہاری لائف میں کچھ اور چاہیے... کچھ اچھا... تازہ... کچھ تمہارے حساب سے...

وہ ہنس کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی ہنسی بھی بے معنی لگتی ہے۔ آرو بھی ایسے ہی ہنسا تھا۔ لگا تھا، جیسے صرف ہنسنے کے لیے ہنسا ہو۔

سندھیا نے سخت احتجاج کیا تھا۔ 'آخر تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟ آخر ایسا کیسے ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہی ہو...؟'

سچ مچ مجھے نہیں پتا تھا، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں صرف اتنا سوچ پا رہی تھی کہ جس کا جو حق ہے...نہیں، اسے بھی میں ٹھیک طرح سے نہیں سوچ پا رہی تھی، بالکل ہی نہیں سوچ پا رہی تھی۔ جب سوچ پانے میں انسان مجبور ہو جاتا ہے تو غیر متوقع طور پر اس کے سامنے کئی کئی راستے نمودار ہونے لگتے ہیں۔

آرو کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا ہے۔ اس کی دائیں بانہہ کھلی ہوئی ہے۔ وہی بانہہ جو میری پناہ گاہ تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ جہانوی کو کِھسکا کر اپنی جگہ پر کرتی ہوں۔

''سو گئے...؟'' اسے ہلاتی ہوں اس کی بغل میں آ کر۔ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود پر جھکے میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے پیار کرنے کے لیے کسی جواز کی تلاش کر رہا ہے وہ...شاید... یا پھر سچ مچ...

عورت مرد کو اسی وقت پڑھتی ہے، جب وہ خود کتاب کی طرح کھلی ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کھوج رہا ہے وہ مجھ میں۔ چھاتیوں کو ایسے کچل مسل رہا ہے جیسے نچوڑ کر نکال لے گا، اپنا من چاہا۔ اسے اپنے اندر سما لینے کے لیے میں نے بھی کھول دیا ہے خود کو پورا کا پورا۔ اس کا جسم سانسوں کی پھنکار سے زاویے بدل رہا ہے۔

قدرت نے عورت کو جس روپ میں رچا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سپردگی کو دیر سے اور فاصلے کو جلدی بھانپ لیتی ہے۔ آرو مجھ میں کہیں ہے ہی نہیں۔ جیسے میں کسی پرائے سے پرایا سکھ لے رہی ہوں۔ جسم تو گونگا ہو گیا تھا، پر من کی زبان

دراز ہوگئی ہے۔

میری آنکھیں کھلی ہیں۔ دیر تک کھلی رہیں۔ الارم کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ صبح کے پانچ بج گئے ہیں۔

مختلف مثبت منفی واقعات پر مبنی دن اور رات، رات اور دن کا سلسلہ جاری ہے...

ایک دن اسکول جاتے وقت جہانوی کہہ رہی ہے۔

''ممّی، اب آپ اپنا لنچ باکس کیوں نہیں لے جاتیں، باہر کا کھانا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا...''

OO

۔ذہن جدید، نئی دہلی شمارہ ۶۵
۔روشنائی، پاکستان، افسانہ نمبر ۲۰۱۵
۔جن پتھ (ہندی) جنوری ۲۰۱۰

پہلا گناہ

صغیر رحمانی

پہلا گناہ

ناظرہ بی کے کوٹھے پر جشن کا ماحول ہے۔

عموماً کوٹھوں پر اس طرح کے جشن کے دو مواقع ہوتے ہیں۔ ایک جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے، دوسرے جب وہ لڑکی سن بلوغت کو پہنچ کر پہلی بار کپڑے کا استعمال کرتی ہے۔ کوٹھوں کی تہذیب میں یہ دونوں مواقع بڑی پاسداری اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

آج ناظرہ بی کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی ثریا جان پہلی بار اپنے فطری بہاؤ سے پاک ہوئی ہے۔ یہ کسی مژدۂ جانفزا سے کم نہیں۔ ناظرہ بی کے ساتھ ساتھ اس کی تینوں لڑکیاں مہک، فلک اور عنبر خوشی اور ولولوں سے بھر اُٹھی ہیں۔ اس موقع پر شام کو چراغاں ہونا ہے۔ پورے کوٹھے کو جھاڑ فانوس سے آراستہ کیا گیا ہے۔ محرابوں اور کھڑکیوں پر لچھے دار چمکیلی بیتوں کی لڑیاں ڈالی گئی ہیں۔ صحن میں ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں گانا بجانا کر رہی ہیں، رقص کر رہی ہیں۔

آج شام ثریا جان کی نتھ اترے گی۔ آج سے وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کی طرح رنڈیوں کی جماعت میں باضابطہ شامل ہو جائے گی۔ وہ کوئی خوش بخت ہی ہوگا جو شام کو اُس وقت کوٹھے پر آئے گا جب ناظرہ بی ثریا جان کی نظریں اتار چکی ہوگی۔ اسے شگن کا میٹھا پلاؤ کھلا چکی ہوگی۔ اسے اپنا مخصوص درس دے چکی ہوگی۔ جب کسی لڑکی کو آج کے دن کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس میں یہ رسومات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ناظرہ بی کی اپنی مرتب کردہ رسمیں ہیں۔ لڑکی کو پہلے خوشبودار پانی سے نہلایا جاتا ہے۔ بعدازاں اس کا بناؤ سنگار کیا جاتا

ہے۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد ناظرہ بی اس کی نظریں اتارتی ہے، اس کی بلائیں لیتی ہے، اس کی کامیاب زندگی کی دعائیں دیتی ہے اور اسے میٹھا پلاؤ کھلاتی ہے۔ اس کے بعد سب سے اہم رسم ہوتی ہے، درس دینے کی۔ ناظرہ بی لڑکی کو دنیاداری سمجھاتی ہے، زمانے کی اونچ نیچ بتاتی ہے، پیشے کی باریکیاں ذہن نشین کراتی ہے جس میں خاص طور پر یہ تنبیہ شامل ہوتی ہے کہ 'لگام ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رہے۔'

ان سب مراحل کے پورا ہونے کے درمیان جو شخص وہاں پہنچتا ہے، اسے لڑکی کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ناظرہ بی کو اپنی چاروں لڑکیوں پر ناز ہے۔ یہ لڑکیاں دریافت نہیں اس کی اپنی کاوش ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کسی کو کسی سے کم تر نہیں کہا جا سکتا۔ بے پناہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مردوں کو زیر کر دینے میں ماہر۔ ناظرہ بی کی لڑائی اب صرف ناظرہ بی کی لڑائی نہیں رہ گئی تھی۔ بیٹیوں نے اسے جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ذرا ثریا جان کے معاملہ میں وہ مطمئن نہیں ہو پاتی۔ مشکوک رہا کرتی ہے کہ اس کے مزاج کی ندرت اس کی سمجھ سے باہر ہے لیکن آج... آج ناظرہ بی کو لاحق تمام وسوسوں، اوہاموں سے نجات مل جائے گی۔ شش و پنج دور ہو جائے گا۔ خدشہ مٹ جائے گا۔ ذہن و دل پر جو ایک نامعلوم سا بوجھ مسلّط رہتا ہے، اس سے گلو خلاصی حاصل ہو جائے گی۔

صحن کے تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی، پیتل کی دستی والے سروتا جو اُسے بے حد پسند ہے اور جو ہمیشہ اس کے پاس رہتا ہے، سے چھالیہ کترتی ناظرہ بی کی آنکھوں میں قدرے آسودگی اور اطمینان کے تاثرات ہیں۔ آج وہ اپنے آخری فرض سے سبک دوش ہونے جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ فخر کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ اپنے جیتے جی اپنی چاروں لڑکیوں کا گھر بسا ہوا دیکھے۔

ناظرہ بی نے گہری سانس خارج کی۔ اللہ اللہ کر کے ثریا جان کی نتھ اتر جائے اور

وہ روزہ نماز کرے۔

ناظرہ بی نے اس کوٹھے کو کوٹھا بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتی، مرد بھی نامراد کیسا احمق ہوتا ہے۔ اپنے ہی کمزور ہتھیار سے قتل ہو جاتا ہے اور اسے علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری انانیت اُس کے اندر گھس جاتی ہے۔ ناظرہ بی کو یاد آتا ہے جب وہ بھاگلپور کے دنگا کے بعد یہاں لائی گئی تھی۔ اس وقت یہ ٹالیوں کی چھپر اور گندے پردوں والا ایک غلیظ چکلا تھا جہاں محض دو لڑکیاں ہوا کرتی تھیں جن کی چھاتیاں کدو کی طرح ان کے پیٹ پیٹ تک لٹک آئی تھیں اور گال گلابی رنگ کے پاوڈر تھوپنے کے باوجود ادھڑے ہوئے پلستر سے جان پڑتے تھے۔ چکلے کی ایک مالکن تھی امینہ بائی۔ عمر کوئی پچاس کے اوپر۔ دمے کی مریض تھی۔ ہر دم اُنہیلر کی پچکاری منہ میں مارتی رہتی۔ اور ایک تھے شبو میاں جو اس چکلے کی مالکن کی عمر کی بہ نسبت تھے تو کم سن لیکن اس کے نام نہاد خاوند ہوتے تھے۔ ایک تو آم کی کھٹائی سی سوکھی، پلپلی ان لڑکیوں میں خاطر خواہ دم نہ تھا، دوسرے مالکن کی دمے کی بیماری۔ کون آتا ایڈز کے ساتھ دمہ مستعار لینے۔ لیکن ناظرہ بی کے آتے ہی چکلے کے مردہ جسم میں جان آ گئی تھی۔ حسین تو تھی ہی بلا کی، جسمانی ساخت بھی ایسی کہ درجنوں مسافر گزر جائیں اور اس کا کچھ نہ بگڑے۔

جسمانی طور پر کچھ بگڑا بھی نہ تھا لیکن روح... روح پاش پاش ہو گئی تھی اس کی۔

بھاگلپور کے دنگے نے اس کا کیا کچھ نہیں لوٹا تھا۔ گھر بار، اپنے بیگانے، سب کچھ۔ جس گاؤں کی تھی وہاں تو لاشوں پر رونے والا کوئی نہ تھا۔ ایک وہی بچ گئی تھی جانے کیسے۔ ایک وہی ہر کسی کے کٹے، جلے، ٹکڑوں پر روتی پھر رہی تھی۔ لاشوں کو ٹھکانے لگانے جب پولیس آئی تو اسے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اسے اپنے زندہ بچ جانے کی پاداش میں کئی راتیں تھانہ میں گزارنی پڑیں۔ راتیں کیا تھیں، رت جگا تھا۔ ایک آتا، ایک جاتا۔ باری باری... بار بار... جیسے نامرادوں

نے کبھی گنگا نہایا ہی نہ ہو۔ یہ تو اسی کا جسم جسیم تھا کہ سالم رہا۔ دوسرے کی تو بوٹی بوٹی یکجا کرنی پڑتی۔ لیکن روح ثابت نہ بچ سکی تھی۔ اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے تھے جب اسے امینہ بائی کے اس چکلا گھر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ امینہ بائی کو اپنے بے نور اور بے وقعت ہو چکے چکلا کے لیے ایک برق صفت جسم کی ضرورت تھی جو اُسے چکا چوند کر دے اور جو اُسے ناظرہ بی کی شکل میں حاصل ہو گیا تھا۔

ایک علاقائی اصطلاح ہے کہ جب رنڈی میں نام درج ہو ہی گیا تو... ناظرہ بی رنڈی بنی اور پکی رنڈی بنی۔ اس نے چکلے کے باہر ایک تختی آویزاں کرائی اور جس پر لکھوایا...

'کوڑے دان کا استعمال کریں'

اس کی اس تنبیہ نے مردوں کے تجسس کو جلا بخش دی۔ اس میں کچھ تو خاص ہے جو دیگر رنڈیوں میں نہیں ہوتا۔ ناظرہ بی کی شکل میں نئی لذت سے ہمکنار ہونے کی جستجو نے مردوں کی شہوانی خواہشات کو بھڑکا کر رکھ دیا۔

جوں جوں اُس کے حسن کی شہرت عام ہوئی اور جوں جوں اس کے جسمانی راز لوگوں پر آشکار ہوئے وہ شہرۂ آفاق کا ستارہ بنتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ علاقے کے دیگر چکلا گھروں میں مردنی چھانے لگی اور اس کے چکلا میں جم غفیر ہونے لگی۔ لیکن یہاں یہ امر واضح ہو جائے کہ مردوں کی نظر التفات کا مرکز یہ چکلا صرف اس لیے نہیں بنا تھا کہ ناظرہ بی حسین تھی اور اس کی جسمانی ساخت غضب کی تھی بلکہ اس کی اصل وجہ تھی اس کے اپنے جسم کے استعمال کا منفرد طریقہ۔

وہاں لذت آمیز عمل کے تمام مراحل روایتی طریقہ کار سے کسی قدر الگ طے کیے جاتے تھے۔ سواری ناظرہ بی کرتی تھی اور لگام اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ ان اوقات میں وہ بالکل ویسے ہی عمل پیرا ہوتی تھی جیسا کہ مرد۔ ان کے چہرے، سینے اور بازوؤں پر ویسے

ہی نشان ثبت ہوتے تھے جیسا کہ ان اعمال سے گزرنے کے بعد عورتوں کے۔ دراصل ناظرہ بی کی مقبولیت میں اس کے اسی وحشیانہ، جارحانہ اور حملہ آور رویہ کا بنیادی دخل تھا۔

شروعات کے دنوں میں جب کوئی مرد الجھن کا شکار بن جاتا تو ناظرہ بی بڑے دل فریب اداؤں کے ساتھ کہتی۔

'آ جا میرے راجہ... خربوز چھری پر گرے یا چھری خربوز پر، کٹتا تو خربوز کو ہی ہوتا ہے...'

اپنی ازلی ذہنیت کے سبب تمام معاملوں کی طرح شہوانی عمل کے دوران بھی مرد اپنے تشخص کو بچائے رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی انانیت کا نفساتی پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آسودگی اور تسکین کو ہی اولیت دینا چاہتا ہے لیکن اپنے سبقت لے جانے والے خصائل کے باوجود اس کے اندرون میں کہیں نہ کہیں یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ بستر پر وہ عورت سے ایسے عمل کی توقع بھی رکھتا ہے جس پر عام طور پر عورتیں عمل پیرا نہیں ہوتیں۔ یہاں اس کو قدرے احتمال کے ساتھ یہ تبدیلی خوش گوار معلوم پڑتی تھی۔ یہاں وہ اپنی شکست کو بھی سرخم تسلیم کرنے سے نہیں چوکتا تھا کہ اس شکست میں لذت اور آسودگی کا بے کراں سمندر پوشیدہ ہوتا تھا۔

ناظرہ بی... ناظرہ بی تو اس کا نمائندہ تھی۔ اس کے ان غیر مروج اعمال میں انھیں اپنے داخل میں موجود اسی مبہم توقع کی تعبیر نظر آتی تھی۔ لیکن یہ بات صرف ناظرہ بی کے شعور میں پنہاں ہوتی تھی کہ اس دوران اپنے ہاتھوں میں لگام اور مردوں کا حال پست دیکھ کر اس کی اَنا کا پندار کس قدر انگڑائیاں لے رہا ہوتا تھا۔

لڑکیوں نے گانا بجانا بند کر دیا ہے۔ غسل خانے میں ثریا جان کو گلاب کے پانی سے نہلایا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ کی آواز ناظرہ بی کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ وہ محبت بھری نظروں سے غسل خانے کی جانب دیکھتی ہے اور اضطراب میں سروتا چلانے لگتی

ہے۔اس کے باطن میں بے چینی سے بھری ہوک اٹھتی ہے، کیا ثریا جان...؟

'یہ شبو میاں بھی نہ جانے کہاں مرکھپ گئے۔ گھنٹہ بھر پہلے سے گئے ہوئے ہیں بڑی الائچی لانے کو۔ کب پلاؤ تیار ہوگا، کب رسمیں ہوں گی؟' ناظرہ بی بڑبڑائی۔ دراصل اپنی بے چینی کو پس پردہ کرنے اور اس مہمل خیال سے اجتناب برتنے کی یہ محض اس کی ایک کوشش تھی۔

شبو میاں آتے ہیں۔ بڑے ادب سے بڑی الائچی کی پڑیا ناظرہ بی کے ہاتھوں میں تھماتے ہیں۔

'آپ بھی شبو میاں...؟' بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ پڑیا کھول کر دیکھتے ہی ناظرہ بی کے ترشے ہوئے ابروتن جاتے ہیں۔

'ارے شبو میاں...آپ بھی سٹھیا گئے ہیں۔آپ سے بڑی الائچی منگوایا تھا، یہ کیا اٹھا لائے آپ؟ الائچی کے دانے؟ اجی آپ کو بڑی الائچی اور الائچی کی تمیز ہے کہ نہیں میاں؟'

'اجی ناظرہ بی...اللہ آپ کی خیر کرے، آپ نے ہی تو کہا تھا بڑی الائچی لانے کو ...تو لے آئے بڑی بڑی الائچیاں۔اب اس سے بڑی تو نہیں مل رہیں۔ کیوں رانی، اس میں کیا قباحت ہوگئی؟ ماشاءاللہ صحت مند دانے تو ہیں۔' جب بھی وہ مستی میں ہوتے ہیں ناظرہ بی کو رانی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

ثریا نہا چکی ہے۔ان کی بحث وتکرار کو سن کر لڑکیاں بھی جمع ہوگئی ہیں۔

'ارے میاں... بڑی الائچی، بڑے بڑے الائچی کے دانوں کو نہیں کہتے۔ بڑی الائچی ایک الگ ہی مصالح ہوتی ہے۔ جایئے، اسے واپس کر آیئے اور بڑی الائچی لے آیئے۔ بڑی الائچی کہیئے گا...بڑی الائچی...' ناظرہ بی نے بڑی الائچی پر زور دے کر انھیں مفصل طور پر سمجھایا۔شبو میاں جھکی کمر کو ہاتھوں سے پکڑے ناظرہ بی کی 'بڑی الائچی' کو سمجھنے

کی کوشش کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

'بتاؤ تو ذرا... الا ئچی کے دانے اٹھالائے۔ ان کا کیا کرنا ہمیں؟ ان کی تو صورت سے ہی کراہیت ہوتی ہے ہمیں'۔ ناظرہ بی نے لڑکیوں کی سمت دیکھ کر کہا۔

'کراہیت کیوں ہونے لگی؟' لڑکیوں کو لگا، ان کو کوئی مصالح مل گیا ہے۔ 'اس الا ئچی کی بھی کوئی کہانی ہے کیا اماں؟'

'اب چھوڑو بھی تم لوگ...' ناظرہ بی چھپٹ چھپٹ چھالیہ کترنے لگتی ہے۔

'اب ایسے تو نہیں چھٹیں گی اماں۔ بتائیے بتائیے...' پلک نے پلکیں جھپکائیں۔

'اب بتا بھی دیجیے...' اس نے ناظرہ بی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

'ارے اب کیا بتائیں، اس نامراد الا ئچی کی کہانی؟ اللہ مغفرت فرمائے ابا مرحوم غفور میاں کی۔ جب میں آٹھ سال کی تھی، بڑے ارمان سے مدرسے بھیجا دو چار حروف پڑھ لکھ لینے کو۔ وہاں کا موبلی... موبلی ہی بولتے تھے ہم سب۔ ہر دم دانتوں تلے الا ئچی کچلتا رہتا تھا اور منہ سے کڑوی باس چھوڑتا رہتا تھا۔ نامراد پڑھاتا کم تھا، ہماری جانگیں زیادہ سہلایا کرتا تھا۔ چھٹی ہونے پر سارے کے سارے اپنے گھر کو جاتے، ایک ہمیں ہی روک لیتا تھا خاص سبق رٹانے کو۔ اب بتاؤ ذرا تم لوگ، ہم کیا طوطا تھے جو اکیلے میں اس کا سبق رٹتے۔ اس کا منشا تو کچھ اور ہی ہوا کرتا تھا جو مجھ نامراد کو اس وقت سمجھ میں نہ آتا تھا۔

تھوڑی دیر الف اور بے... اب، تے اور بے... تب رٹاتا پھر کہتا، چلو اب کھیلتے ہیں۔ پہلے وہ مجھے اپنی پیٹھ پر چڑھاتا، کہتا: میں اللہ میاں کا گھوڑا ہوں اور تو میری سواری۔ پھر میں اللہ میاں کا گھوڑا... گھوڑی... پتا نہیں، بنتی اور وہ میری سواری۔ آٹھ سال کی عمر، کھیل کود کی ہی تو ہوتی ہے۔ اس کی چارخانے کی لنگی کے نیچے کھونٹے جیسی کوئی سخت چیز تن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور میرے پھولے پھولے چوتڑ میں چبھتی رہتی تھی۔ تب اور اچھا لگتا تھا، پورے بدن میں سہرن سی ہوتی تھی۔ دراصل اس نامراد موبلی کی حرکت سے میرے اندر احساس

جا گا کہ لڑکی الگ ہوتی ہے اور لڑکا الگ۔ آخر میں اس کی لنگی گیلی ہو جاتی ، جسے اس وقت میں اس کی مُوت نکل آنا سمجھتی تھی۔ وہ غسل خانے میں بھاگ کر سما جاتا تھا۔ لیکن جاتے جاتے قمیص کی بغلی سے الا ئچی نکال کر دینا نہیں بھولتا تھا۔ پتا نہیں، نامراد کو الا ئچی سے ایسی کون سی انسیت تھی، خود بھی کھاتا اور دوسرے کو بھی کھلاتا۔

ادھر ابّا دیر تک میرے نہیں لوٹنے پر فکر مند ہوتے۔ ایک دن مدرسہ پہنچ گئے۔ میرے اوپر مولبی کی سواری دیکھ بید کی چھڑی توڑ ڈالی اس نامراد پر۔ گاؤں کے دوسرے جن بھی جمع ہو گئے۔ لات اور گھونسوں کی ایسی برسات ہوئی کہ مولبی کی صورت جلی پچکی روٹی بن گئی۔ سرخ سیاہ چکتوں والی شکل لے کر ایسا بھاگا کہ پھر وہ دن اور آج کا دن، نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد تو ابا نے گھر میں ہی بٹھلا دیا اور استانی لگا دی پڑھانے کو۔ گھر سے باہر تو تب ہی نکلی جب خرم میاں، اللہ ان کو جنت میں محلا دو محلا گھر عطا کرے، بیاہ کر اپنے گھر لے آئے...'

شبو میاں بڑی الا ئچی لے آئے۔ اس بار وہ بڑی الا ئچی ہی لائے ہیں۔

'چلو لڑکیوں، اب جاؤ... ثریا جان کو بھی تیار کر دو۔'

'لیکن اماں، وہ ابا...' لڑکیاں ناظرہ بی سے آگے سننا چاہ رہی ہیں۔

'ارے بھاگو بھی... کتنی بار کہا، بے چارے شریف خرم میاں تم حرام زادیوں کے ابا نہ ہوئے کبھی...'

لڑکیاں کھل کھلاتی ہوئی ثریا جان کے کمرے میں بھاگ گئیں۔

ناظرہ بی کے چکلا گھر آنے کے ایک سال کے اندر ہی اس کی مالکن امینہ بائی کھانستے کھانستے مر گئی تھی اور بعد کے دنوں میں دونوں لڑکیاں بھی کہیں گمنامی کے اندھیرے غار میں دفن ہو گئی تھیں۔ رہ گئے تھے صرف شبو میاں جو آج بھی اپنی جھکی کمر کے ساتھ کوٹھے پر اس کونا سے اس کونا کرتے رہتے ہیں۔ ایک مثل مشہور ہے، رنڈی کے گھر

مانڈے اور عاشقوں کے گھر کڑا کے، ناظرہ بی کی جوانی نے دولت کی بارش کر دی۔ ایسی برکت اس نے کسی کمائی میں نہ دیکھی تھی۔ ٹالیوں کی کھپریل والا چکلا گھر جلدی ہی آٹھ کمروں اور ایک بڑے صحن والا کوٹھا بن کر تیار ہو گیا تھا۔

اب ناظرہ بی اس کوٹھے کی مالکن تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا لیکن کوٹھے کے بیرونی حصے میں آویزاں تختی وہی پرانی تھی۔ ناظرہ بی کو شدید طور پر اس بات کا احساس تھا کہ سنگھرش لمبا ہے جس کا سامان اسے پہلے سے ہی کرنا تھا۔ اس خیال کو ترغیب دیتے ہوئے اس نے ایک کے بعد دیگرے کئی بچے پیدا کیے۔ چار کی چار لڑکیاں۔ کوٹھوں پر لڑکیوں کی پیدائش خوش آئند مستقبل کا ضامن ہوتی ہے، یہ چاروں ناظرہ بی کے کوٹھے کا ستون بن گئی تھیں۔

یوں تو کوٹھوں پر پیدا ہونے والوں کے حقیقی باپ کی نشان دہی تردد بھرا کام ہے لیکن......

اپنی لڑکیوں کی طبیعت کا نادرپن دیکھ کر ناظرہ بی کو ایک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ اس کی کس لڑکی میں کس نوع کی جبلت کارفرما ہے۔ ان چاروں کے عادات واطوار، سوچ و عمل میں کوئی مماثلت نہیں۔ جب بھی وہ ان کی ذات کا محاصرہ کرتی، سب کی ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت پاتی۔

سب سے بڑی والی مہک، اس کے طریق و عمل میں کسی حد تک غاصبانہ سوچ کا دخل ہوتا تھا۔ شام کو جب سب بن ٹھن کر بالکنی پر کھڑی ہوتی ہیں، مردوں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے وہ انواع واقسام کے ہتھکنڈے آزمانے سے باز نہیں آتی۔ اپنی بہنوں کو مات دینے اور ان کے مستقل گاہکوں کو بھی اپنی جانب کر لینے کا ہر حربہ وہ خوب استعمال کرنا جانتی ہے۔ مستقل مزاجی تو اُسے چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ کہے گی کچھ کرے گی کچھ۔ اتنا ہی نہیں، مردوں سے اس کی دکان چلتی ہے لیکن ایک بار اس کے لٹکوں جھٹکوں

سے مرعوب ہو کر مرد اُس کے حسن کے جال میں پھنس جائے پھر تو وہ انہیں ایسے نچاتی ہے جیسے مداری والا بندریاں۔ وہ ان کے جسم سے خون کا ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتی ہے۔ بظاہر اپنے مردوں کو وہ یہ باور کرانے سے نہیں چوکتی کہ اس کی بیوی، بہن اور ماں سب سے زیادہ اس کی خیر خواہ ایک وہی ہے اور ان کے سارے دکھوں کا مداوا اس کی زلفوں کے پیچ وخم ہیں۔لیکن ان سب کے پس پردہ وہ صرف اور صرف اپنا الّو سیدھا کر رہی ہوتی ہے۔ بڑی بے شرمی سے کہتی ہے؛'اللہ نے انہیں ہمارے استعمال کے لیے ہی تو بنایا ہے اماں، چند میٹھے بول بول کر اُن کا پورا ہندوستان لوٹا جا سکتا ہے...'

ناظرہ بی ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔جن دنوں مہک پیدا ہوئی تھی ان دنوں... بہت کوشش کے بعد اس کے سامنے ایک گنجلک سا عکس ابھرتا ہے۔ بختاور حسین......

....سیاسی اقتدار کا ایک علاقائی نمائندہ۔ جو اُس کے کوٹھے پر آتا تو تھا رنڈیوں کی از سرِ نو بساہٹ کا پروگرام لے کر لیکن اسے رنڈی ہی بنے رہنے کی تلقین کر کے جاتا تھا۔

اس کے بعد والی فلک، مردوں کے تئیں اس کا رویہ منصفانہ کبھی نہیں رہا۔ وہ تو ایک رنڈی ہے، اسے تو ہر مرد کے تئیں ایماندار اور وضع دار ہونا چاہیے لیکن وہ ان میں بھی امتیاز برتنے میں ماہر ہے۔ کوئی مال دار آسامی ہوا تو وہ اس کی گود میں بیٹھ جائے گی، اسے سہلائے گی۔اس کے برعکس کوئی پھٹا حال آ گیا تو اس کے ساتھ ایسے پیش آئے گی جیسے اس کا وجود ہی ایک گناہ ہو۔ وہ بے چارہ اس کے جلوۂ حسن کے آگے لاچار، بے بس بنا رہتا ہے۔اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بالکنی پر کھڑی ہو کر اپنے حسن و جمال کے تعب سے اکثر و بیشتر ایسے ایسوں کو بھی اپنی زلف گرہ گیر میں مقید کر لیتی ہے جن کا کوٹھے اور کوٹھے والیوں سے دور دور کا واسطہ نہیں ہوتا اور جو بے چارے محض اس گلی سے گزرنے کے قصوروار ہوتے ہیں۔اس کی اپنی ایک اونچی قیمت مقرر ہے باوجود اس کے مردوں کے کپڑے کھونٹی سے

ٹنگتے ہی وہ ان کی طرح ان کی جیب کو بھی برہنہ کر دیتی ہے۔اوروں کو زندگی میں ضابطے کی پابندی کی نصیحت کرنے والی خود اُس کا مطلق پاس نہیں رکھتی۔

ناظرہ بی غور کرتی ہے تو اسے گھنی اور لمبی مونچھوں والا تھانے کے بابو کا چہرہ یاد آتا ہے جو ناظرہ بی کی کمائی میں سے اپنی حصے داری طے کرنے ہفتے کے دن آیا کرتا تھا اور رات بھی وصول کر کے لے جایا کرتا تھا۔

تیسری عنبر، اس کی تو پوچھیے مت۔ جب بھی کوئی مرد اس کے پاس آتا ہے، سب سے پہلے تو وہ اسے جنت اور دوزخ کا فرق سمجھاتی ہے۔ نجات کے لیے اچھے اعمال اور مذہبی ارکان کی اہمیت پر نصیحت کرتی ہے۔ کہتی ہے مذہب ہی آخری سچ ہے بقیہ سب فریب ہے۔ وعظ بیان کرنے کے بعد ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے کہ نیک اعمال، جنت، دوزخ اور نجات کا سارا

فلسفہ اندھیرے کمرے کے کسی کونے میں منہ چھپا کر دبک جاتا ہے۔

ناظرہ بی کو یاد آتا ہے، بابا اوجسوی رام نے ان دنوں ’معاشرتی مذہبی فلاح و بہبود‘ کے عنوان سے کوٹھوں پر جا جا کر معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی آبادیوں کے درمیان وعظ بیان کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انکی تشریف آوری متعدد بار اس کے کوٹھے پر بھی ہوئی تھی۔ ان کی آواز میں مقناطیسی کشش ہوتی تھی۔ ناظرہ بی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتی لیکن اسے اندازہ ہے کہ ان کی سحر بیانی کا اس پر خاصا اثر ہوا تھا، اتنا کہ عنبر ٹھہر گئی تھی۔

سب سے آخر والی ثریا جان، اس کے متعلق ناظرہ بی کو مبہم ہی سہی لیکن نہ کوئی صورت یاد آتی ہے نہ ہی کوئی قیاس گزرتا ہے۔ اس نے اکثر اپنے حافظہ پر زور دے کر اس شکل وصورت کو یاد کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مادہ ثریا جان کی شہ رگ میں دوڑ رہا تھا لیکن حد درجہ کوشش کے باوجود وہ ناکام رہی تھی۔ اسے صرف اتنا یاد آتا ہے کہ ان دنوں ملک کے

حالات بڑے نازک تھے۔ چہار جانب افراتفری، سراسیمگی اور عدم تحفظ کا بول بالا تھا۔ دکانوں میں آگ بک رہی تھی اور سڑکوں پر خون بے قیمت بہہ رہا تھا۔ کیا بچی، کیا جوان اور کیا بوڑھی۔ عزت و ناموس روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی تھی۔ گلی کوچوں، چوک چوراہوں پر حیوان، درندے، بھیڑیے رقص کر رہے تھے۔ لاغر، بے بس، بے حس اور کسی قدر مصلحت پسند نظام تماشابین بنا ہوا تھا۔ سب کچھ اس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس کا وجود جیسے درہم برہم ہو کر بکھر چکا تھا۔

دوسری جانب عوام الناس میں شدید غم و غصے کی لہر تھی۔ صبر و ضبط اپنی حد تجاوز کر چکا تھا۔ احتجاج کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور تبدیلی کی بہار بہہ رہی تھی، ایسے میں ثریا جان نے اس کی جان کے اندر کروٹ لی تھی۔ اب ایسے متغیر ماحول میں ناظرہ بی کے پاس کون آیا، گیا اس کی

تفریق ممکن نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ثریا جان کے مزاج کے انوکھے پن کو سمجھ نہ پائی اور ہر گھڑی اس کے متعلق بے اطمینانی کا شکار رہتی ہے۔

لڑکیوں نے ثریا جان کو دلہن کی طرح سجا دیا ہے۔ دلہن تو ہے ہی۔ رنڈیاں ایسے ہی دلہن بنتی ہیں۔ سرخ رنگ کے ساٹن کے غرارے اور قمیص میں سر سے پاؤں تک سجی دلہن کو بھی مات دے رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خفیف سی الجھن کے تاثرات ہیں۔ تھوڑا خوف، تھوڑی دہشت، تھوڑا تجسس۔ لڑکیاں اسے چھیڑ رہی ہیں۔ ڈرا رہی ہیں ذرا ذرا۔ ذرا ذرا حوصلہ دے رہی ہیں۔ لڑکیوں نے بھی بناؤ سنگار کر لیا ہے۔ اِترا رہی ہیں ادھر سے ادھر۔ ان کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری ہے جس کا نشانہ گاہے بہ گاہے ناظرہ بی بھی بن رہی ہے۔

'ہائے اماں... آپ جب دلہن بنی ہوں گی، قیامت ڈھا رہی ہوں گی؟'

'اررر ے... میں تم لوگوں کی طرح دلہن تھوڑے بنی تھی۔ میں تو سچ مچ کی دلہن بنی

تھی۔خرم میاں باضابطہ شیروانی اور سہرہ میں گھوڑی پر سوار ہو کر آئے تھے مجھے لیوا جانے۔
رات میں گھونگھٹ کھولا تو غش کھا گئے۔ دودھ کی جگہ پانی پلانا پڑا۔لیکن کہا جاتا ہے نا کہ
نعمت نصیب والے کو ہی نصیب ہوتی ہے۔رات میں گاؤں کی پہرہ داری کا کام تھا ان کا۔
پوری رات جاگتے رہو... جاگتے رہو...کی ہانک لگا کر گاؤں کی رکھوالی کرتے تھے اور ادھر
اُن کے اپنے ہی گھر میں ان کے چچازاد بھائی صدن میاں نے سینندھ ماردی۔وہ دوسروں
کے مال کی چوکیداری کرتے رہے، ادھر صدن میاں ان کا مال لوٹتا رہا۔رات کے جاگے
پورا دن سوتے رہتے۔کبھی کچھ کہنا چاہا تو نیند میں بولتے:'خاندان کی عزت کا سوال ہے۔'
اپنی عزت دے کر خاندان کی عزت بچاتی رہی میں۔

شام ہو چکی ہے۔

کوٹھے پر چراغاں کر دیا گیا ہے۔رنگین لڑیوں والی بتیاں جگمگا اٹھی ہیں۔لڑکیوں
کے ناچ گانا، چھیڑ چھاڑ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ہنسی ٹھٹھولی بڑھ گئی ہے۔رسم کی تیاریاں
تکمیل کے آخری مرحلے میں ہیں۔چاندی کی نقاشی دار طشتری میں چاندی کے ورق سے
مزین شگن کا میٹھا پلاؤ لطیف خوشبو بکھیر رہا ہے۔ذرا دیر بعد ناظرہ بی ثریا کے کمرے میں
جائے گی اور اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ میٹھا کرائے گی۔

دریں اثنا ایک نئی بات وقوع پذیر ہوتی ہے۔شبو میاں اپنی جھکی کمر کے ساتھ صحن
میں وارد ہوتے ہیں۔ان کے ہمراہ ایک پولیس والا بھی اندر آتا ہے۔

'ناظرہ بی، یہ بندہ پرور کوٹھے کی تلاشی لینے آئے ہیں...'

'شبو میاں، کیا انہیں پتا نہیں، کوٹھوں پر کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہوتا... یہ سب تو
شریفوں کے چونچلے ہیں...'ناظرہ بی نے اپنی پرانی اداؤں کے ساتھ کہا۔'اگر ان کی خواہش
ہو تو ذرا انتظار کر لیں، رسم پوری ہوتے ہی ثریا جان کی نتھ انہیں کے ہاتھوں اتر جائے گی...'
اس نے چھالیہ پر سروتا کو دباتے ہوئے کہا۔

’ناظرہ بی اُن کا کہنا ہے کہ شریفوں کے محلے میں کسی نے کسی بچی کے ساتھ...اور وہ بدمعاش بھاگ کر اِسی جانب آیا ہے۔‘

یہ سن کر ناظرہ بی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکان پھیل گئی۔اسی مسکان کے ساتھ اس نے کہا۔’لے لو تلاشی بابو جی...‘

پولیس والے نے کوٹھے کے ایک ایک کمرے کی خوب اچھی طرح تلاشی لی۔ جانے لگا تو ناظرہ بی کی آواز اس کی پشت سے ٹکرائی۔

’اتنی بے رخی اچھی نہیں بابو جی...ہم بدنام لوگوں کی بھی ذرا قدر کر لو...تمہارا غم غلط ہو جائے گا کچھ...‘ناظرہ بی نے زور سے قہقہہ لگایا۔

لڑکیاں ثریا جان کے کمرے میں جمع ہو گئی ہیں۔ثریا جان دلہن کی طرح سمٹی پلنگ پر بیٹھی ہے۔ اترنے والی نتھ اس کی ستواں ناک میں دمک رہی ہے۔ ناظرہ بی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ پلنگ پر اس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے۔اسے بھرپور نظر سے دیکھتی ہے۔اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ چاندی کی طشتری سے چاندی کے ورق میں لپٹا اسے میٹھا پلاؤ کھلاتی ہے۔ایک ہزار ایک روپے سے اس کی نظریں اتارتی ہے۔ بلائیں اتار کر انگلیاں چٹکاتی ہے۔بعد ازاں شروع ہوتا ہے درس کا سلسلہ۔کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ درس کی رسم بظاہر تو نئی لڑکی کے لیے ہوتی ہے لیکن اس کی تجدید پرانی ساری لڑکیوں کو بھی کرنی ہوتی ہے۔ساری لڑکیاں پورے انہماک کے ساتھ درس سماعت کر رہی ہیں۔

’...بس یہ کہ لگام ہاتھ میں رہے۔‘ناظرہ بی کا درس ختم ہوا۔ثریا جان کی پیشانی چوم کر وہ کمرے سے باہر آ جاتی ہے۔

رسم پوری ہو چکی ہے۔آنے والے کا انتظار ہونے لگا ہے۔لڑکیاں بھاگ بھاگ کر بالکنی پر جا رہی ہیں۔

وہ آتا ہے۔شاید کوٹھے پر پہلی بار آیا ہے۔ اکبکایا ہوا ہے۔ اوسان خطا سے ہیں۔عمر کوئی پچیس برس۔ نام فیروز۔ پوری رات رہے گا۔لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اسے ثریا کے کمرے میں لے جاتی ہیں۔اسے اندر بھیج کر باہر سے دروازہ بھیڑ دیتی ہیں۔

ناظرہ بی دل ہی دل میں مقدس کلمات کا ورد کر رہی ہے۔آخری فرض پورا ہو رہا ہے۔آخری خواب کو تعبیر مل رہی ہے۔ثریا جان رنڈی بن رہی ہے۔اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ناظرہ بی خوش ہے۔وہ مسرور ہے۔وہ نازاں ہے۔وہ مخدوش ہے....

دفعتاً ثریا جان کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ فیروز خون سے تر بہ تر جانگیا میں باہر نکلتا ہے۔ہاتھوں سے اپنے اگلے حصے کو پکڑے چیختا چلاّتا باہر بھاگ جاتا ہے۔

ناظرہ بی ہکابکا دیکھتی ہے۔

دروازے پر ثریا جان کھڑی ہے۔

'تھوکنے کے لیے آخر چوک چوراہوں پر کوڑے دان کس لیے ہے۔جُو جی کا پانی گرانے کے لیے اتنا ہی بے تاب تھا تو ہمارے پاس چلا آتا، اس بچی کے ساتھ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی...'

اس کے ہاتھ میں ناظرہ بی کے پیتل کی دستی والا سروتا ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے...

ٹپ...ٹپ...ٹپ...

OO

۔آمد، پٹنہ شمارہ ۹

۔ہم عصر اردو افسانہ (عالمی افسانوی انتخاب)، پاکستان، ۲۰۱۵

۔جن پتھ (ہندی) بعنوان 'حرامزادیاں' جنوری ۲۰۱۴

داڑھی: اہل نظر کی نظر میں

۱. محمد حمید شاہد (اسلام آباد) ..
۲. حسین الحق ..
۳. سید احمد قادری ..
۴. غالب نشتر ..

صغیر رحمانی کا افسانوی اختصاص

محمد حمید شاہد (اسلام آباد)

عین آغاز ہی میں بتادوں کہ صغیر رحمانی کے افسانے موضوع کے اعتبار سے دو طرح کا مزاج رکھتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں قسموں کے افسانوں میں بیانیہ بہ ظاہر ایک سا لگتا ہے مگر بہت سلیقے سے ہمارے اس افسانہ نگار نے اسے اپنی نوع کے موضوع میں گوندھ کر بہت لطیف سطحوں پر الگ کر لیا ہے۔ کہہ لیجئے، بیانیہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے، کہ انہیں محض بیانیہ کہانیاں کہہ کر آگے ہو لیں؛ اس کے اپنے تخلیقی چھل بل ہیں، متن میں معنویت کی جوت جگانے والے اور اتنے تازہ کہ قاری کو پہلی سطر سے ہی گرفت میں لے لیں تو ساتھ ساتھ گھمائے پھرتے ہیں، حتی کہ کہانی ختم ہو جاتی ہے......لیکن صاحب، ختم ہونے کے بعد بھی کہانی کہاں ختم ہوتی ہے، یہ تو آخری سطر سے جی اٹھتی ہے، ققنس کی طرح اور پڑھنے والے کے لہو میں گردش کرنے لگتی ہے۔

میں نے پہلی سطروں ہی میں، موضوعات کے اعتبار سے، جن دو الگ طرح کے افسانوں کو ایک سی کامیابی کے ساتھ لکھ لینے کی اس قدرت کا اعتراف کیا ہے جو صغیر رحمانی کو عطا ہوئی ہے، اُن میں پہلی قسم تو اُن افسانوں کی ہے جن میں فرد سے فرد کا تخلیقی سطح پر رشتہ معدومیت کی زد پر ہے ''چانس''، ''آخری لائن''، ''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں''، ''سیڑھیاں'' اور ''میں، وہ اور جہانوی'' جیسے پانچ افسانوں کو میں نے اس ذیل میں رکھا ہے۔ باقی بچ جانے والے بھی پانچ ہی افسانے ہیں، اور ان میں زندگی کا دائرہ پھیلتا ہے ۔ یہاں معاملہ سیاسی، مذہبی اور سماجی

معنویت سے ہوتا ہے۔ان پانچ افسانوں کو بھی گنوائے دیتا ہوں؛''داڑھی''،''جہاد''،''لیکن یہ...''،''ناف کے نیچے''اور''پہلا گناہ''۔

افسانہ''چانس''عورت کا قصہ ہے۔ایسی عورت کا جو مکمل ہونا چاہتی ہے۔جس سماج کا ہم حصہ ہیں کہ اس میں عورت مکمل ہو بھی سکتی ہے؟ اور کیا وہ اپنی ممتا کے جذبے کی تسکین کے ساتھ مکمل ہو جائے گی؟ یہ سوال اپنی جگہ، مگر کیرتی جو چونتیس سال سے خود کو نامکمل جان رہی تھی یقین رکھنے لگی ہے کہ وہ نو ماہ میں مکمل ہو جائے گی۔ایک ادھوری عورت، جسے اپنے شانت بدن سے نفرت ہونے لگتی ہے، گھن آنے لگتی ہے، وہ ڈاکٹر کے اس کہے کو کیسے مان سکتی ہے کہ''اس کے لیے پرگنینسی خطرناک ہے۔''، ہوتی ہے تو ہو، وہ آدھی ادھوری نہیں جی سکتی۔اسے اپنے بدن کے ساتوں سر جگانے تھے۔یہ سر جاگے بھی، مگر ساتویں کے شروع میں ایسا درد جاگا کہ کیرتی سنہا کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔جس نے اسے مکمل ہونا تھا، اسے کیرتی کا پیٹ چاک کر کے باہر نکالا گیا۔صرف چھ مہینے اور کچھ دنوں کا آدھا ادھورا لوتھڑا اسے کتنا مکمل کر سکتا تھا۔صاحب عجب کہانی ہے، عورت کے خالص تخلیقی اور لطیف جذبوں کے مطہر پانیوں سے ایک ایک لفظ کو غسل دے کر اس کہانی کو بُن لیا گیا ہے۔

''آخری لائن''میں بھی خالص تخلیقی اور لطیف جذبوں کو کہانی بنا لینے کا ہنر ملتا ہے، مگر صاحب، یہاں کہانی آخری سطروں میں سارا معاملہ اوندھا دیتی ہے۔تخلیقی عمل کے بھید بھنور کہتی اس کہانی میں، لکھنے والا جس موضوع کو لکھ رہا ہے(نہیں، بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ محض لکھ نہیں رہا''چانس''کی کیرتی کی طرح تخلیقیت کا کرب سہتے ہوئے جنم دے رہا ہے)اس میں بازار، انسانی نفسیات کو اتھل پتھل کیے ہوئے ہے۔کہانی کو ایک سے زیادہ سطحوں پر بنتے ہوئے صغیر رحمانی نے لکھنے والے کے اندر سے اس انسان کو ڈھونڈھ نکالا ہے جسے بازار نے شقی القلب بنا یا ہوا ہے۔وہ زمانہ گیا جب اتنے ہی پاؤں پھیلائے جاتے تھے جتنی چادر میسر ہوتی تھی، کہ اب تو ہماری ضرورتیں بازار متعین کرتا ہے، ایسے میں رشتوں سے رشتوں کی حدّت کا الگ ہونا یقینی تھا،

وہ ہوا۔ اعتماد سے اعتماد کی استقامت چھن گئی، محبت سے محبت کی کشش کو جدا کیا گیا۔ انسان میں انسانیت نہیں رہی، سارا معاشرہ پیداوار کی صورت ہو گیا۔ یہ وہ موضوع تھا جسے لکھی جانے والی کہانی میں لکھا گیا ہے مگر وہ کہانی جو لکھنے والے کے وجود سے چھلک پڑتی ہے، تیزاب کی طرح، اس نے اس عہد کے انسان کے چہرے کو اور بھی مکروہ بنا دیا ہے۔ ٹی وی اشتہارات کی سدھائی ہوئی صارفی ذہنیت جیت جاتی ہے۔ جی ایسی صارفی ذہنیت جس میں ضرورت ہو یا نہ ہو، نان سٹیک پین اہم ہو جاتا ہے، یوں کہ اس پر دیوالی پر چھوٹ مل رہی ہے۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ نفیس ترین جذبوں کی کہانی لکھنے والا بھی ہسپتال کے باہر سڑک کنارے ایک مجبور باپ کے بیٹے کی لاش پر پھسلتی نظر ڈالتا ہے اور نان اسٹیک پین خریدے نکل جاتا ہے۔

افسانہ ''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' شرماوِلا کے مکینوں کا قصہ ہے۔ کہہ لیجیے، شرماوِلا کے اے پی شرما، ان کے دو بیٹوں، بہوؤں اور سونو نام کے ایک پوتے کی کہانی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ آخر میں یہ محض اُس زندگی کی کہانی ہو جاتی ہے جو ہمارے وجودوں سے نکل گئی ہے۔ کسی کو بھی اس زندگی کے یوں بہہ نکلنے کا دھیان نہیں ہے، بس ایک اے پی شرما ہے جو بدن کی ہر دراڑ میں سے حیاتی کے پانیوں کو بہہ نکلنے سے روک رہا ہے۔ اے پی شرما ملازمت سے سبک دوش ہو چکا ہے مگر زندگی سے سبک دوش ہونا نہیں چاہتا، مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا اور ایسے جتن کرتا ہے جو اُس کی اولاد کی نظر میں بوڑھوں کو نہیں جچتے۔ ماں بہن کی گالیاں بکتے احمد بھائی کی دکان پر بیٹھنا ہو یا اوورکوٹ ہیٹ بھول کر سردی میں واک پر نکل جانا، اپنے دوست گجادھر کے ساتھ ہلا گلا کرنا ہو یا کمپیوٹر پر نیٹ سرفنگ، یہ سب مرنے سے پہلے جیے چلے جانے کے حیلے ہی تو ہیں۔ ہم اِس طرح بوڑھوں کو کہاں جینے دیتے ہیں۔ ہمیں یہ جوشاندہ پیتے ہوئے، کھانستے ہوئے، ہائے ہائے کرتے، بستر پر لیٹے آخری گھڑیاں گنتے نظر آئیں تو بھلے لگتے ہیں، سو کہانی کے اے پی شرما کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اسے سمجھایا جاتا ہے کہ محلے میں اور بھی بوڑھے ہیں، ان کی طرح رہیے۔ صغیر رحمانی کی کہانی والا بوڑھا، جو مر کی جینا نہیں چاہتا تھا چپکے سے مر جاتا ہے۔

افسانہ ''سیڑھیاں'' کو مصنف کے اس ایک جملے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ''سیڑھیوں کی یہ خوب صورتی ہوتی ہے کہ وہ بلندی کو چومتی ہیں اور پستی کو بھی۔'' چوہدری شجاعت حسین کی یہ کہانی اس کے والد چودھری عنایت حسین کی بلندیوں اور پستیوں سے جڑی ہوئی ہے۔ مجھے اس افسانے کے جس کردار نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ امینہ بائی کا ہے، وہی امینہ بائی جو بلندیوں کا حاصل تھی، شام کی محفل میں طاؤسی رقص پیش کرنے والی، چودھری عنایت حسین کے قلب میں بے تابیاں بھرنے والی اور ان کے سامنے ایک موری پر بیٹھ کر پانی چھوڑتے ہوئے ایک خاص طرح کی موسیقی پیدا کرنے والی۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ اس خاص موسیقی سے چودھری عنایت حسین اتنے مسرور و محظوظ ہوا کرتے تھے کہ کئی علاقے اس کے نام کر دیے۔ وقت ایک پہلو پر کہاں پڑا رہتا ہے، سو اُس نے کروٹ لی۔ ملک تقسیم ہو گیا، چودھری عنایت حسین نے امینہ بائی کے لیے وطن ترک نہ کیا۔ مگر بتایا جا چکا کہ وقت تو پہلو بدل چکا تھا زمینداری جاتی رہی، امینہ بائی دق کی مریضہ ہو کر مر گئی۔ لیجیے یہاں یہ بھی بتانا ہوگا کہ یہ کہانی امینہ بائی اور چوہدری خاندان کی بلندی اور پستی کی نہیں اُس سیڑھی کی ہے جسے وقت نے اپنے سنہرے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے۔ اس سیڑھی کی خوب صورتی یہ ہے کہ اس پر ربّو جولاہے کا بیٹا انور بھی پاؤں دھر سکتا ہے اور چودھری خاندان کا معرفت حسین بھی۔

اسی قبیل کے آخری افسانے ''میں، وہ اور جہانوی'' میں سب کچھ ٹھیک ہے، مگر کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں ماں باپ اور اولاد جیسے رشتے ہیں مگر ان کے بیچ کہیں ایسا رخنہ رہ جاتا ہے کہ بظاہر جڑے ہوئے نظر آنے والے تعلق میں سے ان رشتوں کی مہک معدوم ہو جاتی ہے ۔اماں سوتیلی نہیں سگی تھی مگر کمیش کو تھن سے تازہ نکالا گرم سا دودھ دیتی اور بیٹی کو پانی ملایا ہوا۔ اس کا خیال تھا بیٹا نام و نسب بڑھانے والا تھا۔ اگر ایسا تھا، تو بیٹی کیا تھی؟ یہ وہ توہین تھی جو سندھیا کی برداشت سے باہر تھی۔ بعد میں قائم ہونے والے رشتے پر بھی اسی توہین کے چھینٹے پڑتے رہتے۔ آرو، اس کا محبوب شوہر، جو سوتے ہوئے اور بھی پرکشش لگتا، اس سے قائم ہونے والا رشتہ پریم کا

تھا، مگر غیر برادری والے پریمی سے شادی انہی ہتک کے چھینٹوں کا نتیجہ بھی تھی۔ سندھیا کو محبت مل گئی مگر اس محبت کو شاداب رکھنے کے کچھ اور تقاضے تھے۔ صغیر رحمانی اس کہانی میں بہت چابکدستی سے ان تقاضوں کو نشان زد کر دیا ہے اور اس صورت حال کو بھی جو بہ صورت دیگر بیان نہ ہو پاتی مگر کہانی کے بیانیے میں گندھ کر قاری کی حسیات کا حصہ ہو جاتی ہے۔ سورج کا ڈوبنا ہو یا کہانی کے اختتام میں یہ جملہ؛ ''ممّی، اب آپ اپنا لنچ باکس کیوں نہیں لے جاتیں، باہر کا کھانا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا...'' بہت کچھ سجھا دیتا ہے۔

دوسری نوع کی جن کہانیوں کا ذکر یہاں بعد میں آئے گا، اُن میں فرد اور اجتماع سے کہیں زیادہ اس عصری حسیت سے معاملہ اہم ہو جاتا ہے جس نے ہمارے تہذیبی امی جمی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ موجودہ عہد کو دانش وروں نے دہشت کا زمانہ کہا ہے۔ ایسا زمانہ کہ جس میں انسانی زندگی بے توقیر ہو گئی ہے۔ قوت اور پیداواری منابع پر قبضے کا چلن عام ہے۔ ملکوں پر یا تو براہ راست حملہ کر دیا جاتا ہے یا پھر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے عالمی سامراج، مقامی کٹھ پتلی حکمرانوں کو اپنا ہرکارہ بنا لیتا ہے۔ عالمی سامراج نے داخلی ہرکاروں کی مدد سے دہشت کے اس زمانے میں ہماری حسیات کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ میں نے کہیں جو لکھا تھا وہ یہاں بھی دہراتا ہوں کہ ایک زمانہ تھا، ہم خوف' نفرت' غصے اور مایوسی کو الگ الگ محسوس کرنے اور بیان کر دینے پر قادر تھے، اب یوں لگتا ہے، ایسا ممکن نہیں رہا ہے۔ خوف کب نفرت میں ڈھلتا ہے اور نفرت کب غصے کے بعد مایوسی میں' ہم چاہیں بھی تو ڈھنگ سے جان نہیں پاتے۔ مسلسل حراس نے آدمی سے اس کے حواس چھین لیے ہیں۔ جس عہد میں ہم جی رہے ہیں اسے محض حواس باختگی کا زمانہ ہی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں زندگی کے لطف اور اس کے اندر موجود تخلیقیت کو لذت اور افادیت سے بدل لیا گیا ہے۔ جی صاف لفظوں میں کہوں تو یوں ہے کہ تخلیقی عمل جو انسانی زندگی کو ایک خاص لطف سے ہمکنار کرتا تھا وہ آج کے عہد کی بظاہر ترجیحات میں کہیں نہیں ہے۔ میڈیا کی مقبولت اور پھیلاؤ نے جس نمائشی اور لذیذ زندگی کو مابعد جدیدیت والے جدید تر آدمی کے لیے نمونہ بنا دیا ہے، اس

نے تہذیبی اور اقداری نظام میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ ایسی دراڑیں آپ ان افسانوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے مگر انہیں بہت واضح صورت میں دوسری قبل کے افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً دیکھیے کہ ''جہاد'' ان دنوں تک کہ جب تک روس افغانستان میں پسپا نہیں ہوا تھا، سامراجی قوتوں کا محبوب بیانیہ تھا۔ بدلی ہوئی صورت حال میں، جہادی آدمی مردود ہو گیا ہے مگر اپنے رد کیے جانے تک اس آدمی نے اس مذہبی اصطلاح کے معنی تک بدل کر رکھ دیے ہیں ۔''جہاد'' نامی افسانے کا شمس، دین کے جس تصور کی تبلیغ کر رہا ہے، اس کی صورت بہت بگڑ چکی ہے، اب تو اس کی نسل بھی اس بگاڑ کا شکار بن رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے افسانہ نگار نے اس کردار کو اہمیت دی ہے جو اپنے بچوں کی پرورش اپنی محنت سے کمائے ہوئے رزق سے کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانہ پڑھتے ہوئے ہم بھاگلپور، میرٹھ، ممبئی، گجرات کے واقعات پر کڑھنے والے، ایران، عراق، افغانستان اور پاکستان کے لیے تڑپنے والے جہادی تبلیغی ملا سے کہیں زیادہ اس محنت کش درزی کے قریب ہو جاتے ہیں جو ایک حادثے میں زخمی ہونے والے اپنے پڑوسی کو خون دینے نکل کھڑا ہوتا ہے کہ آخر کو دونوں کا خون ایک سا ہے۔

جس طرح کا جہادی مبلغ ''جہاد'' میں شمس کے کردار میں دکھایا گیا ہے، ایسے ہی لائق نفریں کرداروں سے مل کر وہ فسادی طبقہ تشکیل پاتا ہے، جس نے داڑھی والے ہر شخص کو دہشت گرد بنا دیا ہے۔ وہ دہشت گرد ہے یا نہیں مگر اپنے اس حلیے میں ہم اسے دہشت گرد کے طور پر دیکھنے کو مجبور ہیں۔ افسانہ ''داڑھی'' فی الاصل داڑھی اور دہشت گرد کا افسانہ نہیں ہے، یہ تو اس دہشت زدگی کا افسانہ ہے جو ہمارے وجودوں سے گندی پیپ کی طرح رس رہی ہے۔ ایک عجب طرح کی بے چینی، گھبراہٹ، اضطراب ہے جو ہم کہیں بھی ہوں ہمیں چپکے سے آ لیتا ہے اور اندر سے ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ چپے چپے پر پولیس ناکے، تلاشی، میٹل ڈیٹکٹر، سونگھتے کتے، جگہ جگہ بالو بھری بوریاں، ان کے پیچھے بندوق سنبھالے کمانڈوز، چلتے چلتے کہیں بھی روک لیا جانا، سامان کا کھلوایا جانا اور ایک ایک چیز کو باریکی سے دیکھنا، یہ انسانی انا پر لگنے والے مسلسل چرکے ہیں۔

انہی کے بیچ کہانی کا ایک کردار مشکوک ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کے چہرے پر داڑھی ہے۔ وہ منھ کیوں چھپاتا ہے؟ وہ ادھر ادھر دیکھتا کیوں ہے؟ وہ اٹھ کر کیوں گیا ہے؟ کہانی ختم ہو جاتی ہے ، کچھ بھی غلط نہیں ہوتا مگر کیا جو ہو رہا ہے وہ سب صحیح ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو کہانی اپنے آخر میں اُچھالتی ہے اور مسلسل تذلیل سے دوچار انسانی وجود کا احتجاج ہو جاتی ہے۔

افسانہ ''لیکن یہ'' میں صغیر رحمانی نے 'جہاد' والے مولوی شمس کو کریم بخش سے بدل لیا ہے اور ''داڑھی'' والے مشکوک کردار کو کریم بخش کے بیٹے اسلام سے۔ جس نہج پر زمانے کی ہوا باندھ دی گئی ہے اس میں شمس کریم جیسے مثبت کردار کے حامل لوگ بھی اپنی ساری تعظیم اور تکریم سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور وقت کے رحم و کرم پر یوں بے بس کر دیے گئے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی مذہب کی ان تعلیمات کے مطابق ڈھال نہیں سکتے جنہیں جو ساری زندگی درست سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ امن اور سلامتی کی تعلیم دینے والے کریم بخش کا بیٹا، دہشت گرد ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے کمال مہارت سے اسلام کو دہشت گردی سے جوڑا بھی ہے اور الگ کر کے دکھایا بھی ہے۔ صبح صبح دو گھنٹے محلے کے بچوں کو مفت اردو اور عربی کی تعلیم دینے والا کریم بخش، ابھرے ناک، پچکے گال اور کھچڑی داڑھی والا، جو سفید کرتا پاجامہ پہنتا اور بھی اجلا لگتا تھا، گول ٹوپی پہنے اور کاندھے پر چارخانے گمچھے کو دھرے، مار دیے جانے والے ایک دہشت گرد کی لاش شناخت کر رہا ہے: ''چلیے کریم بخش... شناخت کیجیے.. اس نے ابھی ابھی... چالیس بے گناہوں کو... کیا اب بھی آپ کہیں گے... اسلام ایسا نہیں ہو سکتا... اسلام ایسا نہیں کر سکتا...؟'' کریم بخش لاش کو دیکھتا ہے اور اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسی کا بیٹا اسلام ہے۔ تاہم وہ زور دے کر کہتا ہے ''لیکن ... یہ اسلام نہیں ہے...'' اسلام اصل میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ ایسی صورت حال میں اس طرف کوئی دھیان نہیں دیتا کہ ایسے میں تو سب اس دہشت کو دیکھ رہے ہیں جو اسلام سے چپک کر رہ گئی ہے۔

افسانہ ''ناف کے نیچے'' میں اسی صورت حال کو ایک اور رُخ سے دیکھا گیا ہے۔ یہاں باقاعدہ دہشت کے اسباب نشان زد ہو رہے ہیں۔ سماجی ناہمواری، عدم اعتماد، انسانی تذلیل

غرض ہر پہلو سے اور ہر زاویے سے دہشت زدگی ور دہشت گردی کی طرف بڑھتے سماج کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ کہانی کی تکنیک سے افسانہ نگار نے سماجی تقسیم کو اور بھی نمایاں صورت میں دکھا دیا ہے۔ کہانی انسانی تذلیل کے تسلسل میں بندھے ایک کنبے سے شروع ہوتی ہے، تکریم پانے کی تاہنگ میں تبدیلی مذہب کا ارداہ کرنا اور اس کردار کا عدم پتہ ہو کر پھر سامنے آ جانا، اپنے اپنے عقیدوں کی سدھائی ہوئی نفسیات کے تضادات کو یوں سامنے لے آتا ہے کہ سارے میں تشدد پھوٹ پڑتا ہے۔ شمالی ٹولے کے ایک تاریک کمرے سے شروع ہونے والی کہانی، گول گنبد والی عبادت گاہ کے صحن سے ہوتی، نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کے چبوترے پر پہنچتی ہے تو بظاہر ایک نظر آنے والے معاشرے کے سارے تضادات باہر اُبل پڑتے ہیں، یوں جیسے آگے کو نہ کھلنے والا گٹر اُبل پڑتا ہے اور اندر چھپی ہوئی ساری غلاظت سامنے آ جاتی ہے۔ کہانی کچھ اور مراحل بھی طے کرتی ہے جیسے گاؤں کے فٹ بال میدان اور سیاسی پارٹی کا دفتر، یہ وہ مراحل ہیں جہاں اس تصادم اور معاشرتی تضاد سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کے جتن ہوتے ہیں حتی کہ انسانیت کی لاش بدبو چھوڑنے لگتی ہے۔

اس کتاب کا آخری افسانہ ''پہلا گناہ'' بظاہر ناظرہ بی کے کوٹھے کی کہانی ہے۔ محض کوٹھے کی نہیں، ناظرہ بی بی کی اپنی اور اس کی سب سے چھوٹی لڑکی ثریا جان کی کہانی بھی ہے۔ اِسے لکھتے ہوئے افسانہ نگار کی نظر میں وہی سماج رہا ہے جو اندر سے سفاک ہو چکا ہے۔ کوٹھے کے منظر نامے میں ناظرہ بی بی کی اپنی کہانی (جس میں اس کے ساتھ ایک مولوی کا اولین جنسی تجربہ موجود ہے) اور اس کی چاروں بیٹیوں کے وجودوں کی تخلیق میں کام آنے والے نطفوں کی شناخت سے ایک پس منظر فراہم کیا گیا ہے۔ کہانی وہاں سے آغاز پاتی ہے جہاں سے چوتھی بیٹی پہلی بار اپنے فطری بہاؤ سے پاک ہو رہی ہے۔ ثریا جان کی نتھ اترنے کا دن دراصل اس کا اپنی ماں اور بہنوں کی طرح رنڈیوں کی جماعت میں باضابطہ شامل ہونے کا دن ہے۔ ایسے میں وہ اپنے حافظے پر زور دے کر اس شکل وصورت کو یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کا مادہ ثریا جان کی

شہ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ وہ حد درجہ کوشش کے باوجود اس کے تعین میں ناکام رہتی ہے۔ ایسی الجھن اسے باقی تینوں بچیوں کے حوالے سے نہیں ہے تاہم ثریا جان کے حوالے سے اُسے اتنا یاد ہے کہ ان دنوں افراتفری اور سراسیمگی کی بوچھاڑ کا زمانہ تھا۔ دکانوں کو آگ لگادی جاتی اور سڑکوں پر خون بے قیمت بہہ رہا تھا۔ کیا بچی، کیا جوان اور کیا بوڑھی۔ عزت و ناموس روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی تھی۔ گلی کوچوں، چوک چوراہوں پر حیوان، درندے، بھیڑیے رقص کر رہے تھے۔ لاغر، بے بس، بے حس اور کسی قدر مصلحت پسند نظام تماشا بین بنا ہوا تھا۔ سب کچھ اس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس کا وجود جیسے درہم برہم ہو کر بکھر چکا تھا۔ ایسے میں ثریا جان نے اس کے وجود میں کروٹ لی تھی۔ ناظرہ بی بی کو خیال آتا تھا کہ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ وہ کبھی ثریا جان کے مزاج کے انوکھے پن کو سمجھ نہ پائی اور ہر گھڑی اس کے متعلق بے اطمینانی کا شکار رہی ہے۔ اس پس منظر سے کہانی کا وہ دہشت والا منظر جڑا ہوا ہے جو موجودہ صورت حال کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ ثریا جان کے کمرے سے فیروز خون سے تر بہ تر جانگیے میں باہر نکلتا ہے۔ اس کے پیچھے دروازے پر ثریا جان کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ناظرہ بی بی کے پیتل کی دستی والا سروتا ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے......

آخر میں مجھے کہنے دیجئے کہ صغیر رحمانی نے بہت خوب صورتی اور سہولت سے روح عصر کو اپنی کہانیوں کے تانے بانے میں بُن لیا ہے۔ خالص فکشن کے قرینے سے رواں، تازہ اور زندہ بیانیہ تخلیق کرتے ہوئے وہ اپنے متن میں ایسا وصف پیدا کر لیتا ہے، جو بس اسے ہی ودیعت ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے، اس لائق ہیں کہ انہیں توجہ سے پڑھا جائے۔ اور یہ بھی کہ یہ افسانے اپنے اندر ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان کا لفظ لفظ اپنے پڑھنے کے لہو میں گردش کرنے لگے۔

☆☆☆

صغیر رحمانی کے افسانے

حسین الحق

صغیر رحمانی افسانے کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہیں۔

وہ مدتوں سے افسانے لکھ رہے ہیں اور ان کے کئی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ صغیر رحمانی مجھے بنیادی طور پر زمین کے آدمی محسوس ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی جدوجہد سے جڑے ہوئے آدمی ہیں اور شاید اسی لئے انہوں نے زندگی کی زمینی سچائیوں کو دل کھول کر قبول کیا ہے۔ نتیجتاً ان کے افسانے ان کے اردگرد کی جو کہانی بیان کرتے ہیں وہ ''اردگرد'' جھل جھل جھلکتا ہے، یعنی ان کی کہانیوں میں جو بھی ماحول ہے وہ فطری ہے مگر باہر سے، ان کے اردگرد سے ان کے اندر اترا ہوا ہے۔

ان کی ایک کہانی ہے ''داڑھی'' جس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک عورت اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے کی غرض سے ٹرین پر سوار ہوتی ہے، مگر اسٹیشن پر ہی خبر مل جاتی ہے کہ کہیں دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے، اس خبر سے اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں، مزید برآں جب سامنے کی برتھ پر ایک داڑھی والے کو منہ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو راستے بھر یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہے کہ کہیں وہ بھی دہشت گرد نہ ہو اور ٹرین میں دھماکہ نہ کردے۔ اسی سوچ میں ساری رات گزر جاتی ہے اور اس کا اسٹیشن آجاتا ہے، وہ اُتر جاتی ہے، داڑھی والا بھی اتر جاتا ہے اور پھر کدھر چلا جاتا ہے پتہ نہیں چلتا۔

دوسری کہانی ''لیکن یہ'' ایک کردار کریم بخش کی کہانی بیان کرتی ہے جو سماج میں

بھتنیک، شریف، امن پسند، عبادت گزار اور مثالی آدمی سمجھا جاتا ہے، وہ اتنا اچھا آدمی ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے دلوں میں اس کی عزت ہے، مگر اس کا بیٹا دہشت گرد بن جاتا ہے اور پولس سے مڈبھیڑ میں مارا جاتا ہے۔اس کی لاش دیکھ کر کریم بخش اقرار کرتا ہے کہ وہ اسی کا بیٹا ہے مگر اپنی بات پر اُس لمحے میں بھی قائم رہتا ہے کہ ''یہ اسلام نہیں ہے''

''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' ایک ایسے بوڑھے کی کہانی ہے جو اپنی زندگی جینا چاہتا ہے۔اس کے بال بچے یعنی نئی نسل باپ کے اس انداز کو غیر فطری سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ سماجی Status que قائم رکھے لیکن وہ ساری زندگی اپنی من چاہی زندگی جیا اور اُسی طرح جیتے جیتے ایک دن مر گیا تو بچوں کو احساس ہوا کہ پچھلی نسل اور اگلی نسل کے بیچ ایک جو محبت یا اپنائیت کا جذبہ ہوتا ہے، وہ پچھلی نسل (اور روایات) کے مرجانے کے بعد بھی ہر عہد کی نئی نسل کا پیچھا کرتا ہے۔اندر کی اسی 'لکا چھپی' سے گھبرا کر اس کا بیٹا باپ کے مرنے کے بعد کہتا ہے کہ ''بہت تنگ کرتے ہیں بڑھو!''

ایک اور کہانی کا عنوان ہے ''چانس''۔اس کہانی میں ایک عورت ہے جو جسی حادثے کی وجہ سے ماں نہیں بن پا رہی ہے۔بالآخر اُس کی بیٹی جو چھ ماہ اس کی کوکھ میں رہی، اسے بقیہ کے تین مہینے ایک انکیوبیٹر میں گزارنے پڑے اور اس طرح وہ عورت ماں بن کر مکمل ہوئی مگر بد قسمتی یہ کہ ایک دن وہ غائب ہوگئی، ماں جب بہت پریشان ہوگئی تو باپ نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ: آؤ چلو! میں تمہیں اسے اپنی کہانیوں میں بڑا ہوتے دکھاتا ہوں''

''ناف کے نیچے'' ایک دلت ہندو کی کہانی ہے جو برہمنی نظام کے جبر و ظلم سے گھبرا کر مسلمان ہو جاتی ہے اور ہندو اسے مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کر ڈالتے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ مسلمان بھی اسے اپنے قبرستان میں صرف اس لئے دفن کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ وہ دلت تھا۔

''میں، وہ اور جہانوی'' ایک ایسی غیر آسودہ عورت کی کہانی ہے جسے مطمئن ہونے کیلئے اسے اپنے شوہر کے اندر دوسرا مرد دیکھنا اور تلاش کرنا پڑتا ہے۔

''پہلا گناہ'' بالا خانے کی کہانی ہے جہاں کی ایک طوائف اپنی نتھ اُترنے کے دن اپنے پاس آنے والے مرد کا عضوتناسل کاٹ لیتی ہے جس کی اس حرکت کا جواز نائکہ کے الفاظ میں کچھ یوں ہے کہ: ''تھوکنے کیلئے آخر چوک چوراہے پر کوڑے دان کس لئے ہے، جو جی کا پانی گرانے کے لئے اتنا ہی بیتاب تھا تو ہمارے پاس چلا آتا، اس بچی کے ساتھ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

مذکورہ بالا کہانیوں کی روشنی میں یہ بات تو بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ صغیر رحمانی کو کہانی بُننے کا فن آتا ہے، وہ جتنی محنت سے کہانی بُنتے ہیں اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ قاری اُن کی کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جذبے کے نگارش کا بھی یہاں اہتمام نظر آتا ہے، چند مثالیں دیکھئے:

(۱) تاریکی کے باوجود کیرتی سنہا کے چہرے پر نفرت اور غصے کا چنگھاڑتا سمندر دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں اور سانسوں کا ایسا بے ترتیب سلسلہ کہ اس کا پورا جسم پھول پچک رہا تھا (چائمس)۔

(۲) ایک طویل و عریض بدہیئت اژدہا اسے چاروں جانب سے اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہے اور اپنے دہانے کو پھیلا کر اسے پورا نگلنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے جسم کی ہڈیاں چیخ رہی ہیں اور روح گھٹتی جارہی ہے۔ (ناف کے نیچے)

(۳) بچپن کا وہ ڈوبتا سورج، صرف ایک سورج نہیں تھا۔ گہری خاموشی اور سناٹے کے بیچ اس ڈوبتے سورج نے میری سوچ اور میرے خیالوں کو پروئے اڑان لی، اس نے اس حس باطنی کو جھجکور دیا جسے میں جانتی تک نہیں تھی، اور اس نے میرے ادراک کو جلا بخشی، میرے اندر کویتا، کہانی، سنگیت رنگ نہ جانے کیا کیا پیدا کئے، جیسے اس ڈوبتے سورج نے مجھ سے میرا تعارف کرایا، پہچان کروائی، میں نے دیکھا، میں جتنی باہر تھی اس سےکہیں زیادہ اپنے اندر تھی (میں، وہ اور جہانوی)

ان اقتباسات میں جذبات کے اظہار کا دو طریقہ اپنایا گیا ہے، جذبات کا قلبی اظہار

اور مختلف صورت احوال کے سہارے جذبات کا اظہار، اور دونوں ہی میں صغیر تقریباً کامیاب رہے ہیں۔ جذبات نگاری کا یہ رخ جس کے اظہار کے لئے صغیر نے جانی پہچانی تشبیہیں بھی استعمال کی ہیں، صغیر کی اس تخلیقی لپک کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو کسی بھی ادیب وشاعر کے لئے ضروری ہے۔

چونکہ صغیر پابندی سے ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور ہندی کے افسانوی بیانیہ سے جڑے رہتے ہیں لہٰذا اثر کا پڑنا تو فطری ہے مگر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ہندی لفظیات اور ہندی میں الفاظ کی ادائیگی کا طرز اردو سے مختلف رہتا ہے۔ عام طور پر (بہ استثنائے چند) ہندی افسانہ نگار بیان کے بارے میں سوچتا ہے، بیانیہ کے بارے میں نہیں، اس کے باوجود صغیر کا بیانیہ قاری کو خود سے جوڑے رہنے میں کامیاب رہتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

حالانکہ مجھے ذاتی طور پر اس بیانیہ سے اور لسانی سطح پر اجنبی گرامر سے اختلاف ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صغیر کا بیانیہ اردو کے قاری کو بار بار دھچکا پہنچاتا ہے اس کے باوجود تخلیقی طور پر جو درد ان کے اندر انگڑائیاں لیتا ہے، ہر صورت حال کو جس طرح منفرد انداز میں سمجھنے اور برتنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ایک نتیجہ تو بین طور پر سامنے آتا ہے کہ ان کا بیانیہ صحافتی بیانیہ سے بالکل پرے ہٹ کر تخلیقی بیانیہ کی طرف مائل رہتا ہے، فنکار کا یہ ذہنی اختصاص بھی اس کی انفرادیت کا نشان قرار دیا جاسکتا ہے۔

صغیر کے یہاں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ان کا تخلیقی داخل اپنے لئے جس زمین کا انتخاب کرتا ہے وہاں زیادہ تر سب الٹرن طبقے سے متعلق ہے، مزید برآں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے مردوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی بیش از بیش کہانیاں عورتوں کی طرف یا ملے جلے کرداروں پر توجہ دیتی ہیں مگر اس میں بھی ان کی زیادہ ہمدردیاں عورتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ اپنے وسیع تناظر میں عورتوں کے مسائل بھی سب الٹرن مسائل کا ایک حصہ کہی جاسکتی ہیں اس لئے کہ بنیادی بات تو پسماندگی اور جبر ہے، اور یہ دونوں برداشت کرنے والا سب الٹرن کلاس ہی ہے۔

ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ صغیر افسانے کھلے پن کے کم شائق ہیں، افسانہ پہلا گناہ میں فیروز کا خون میں تر بتر جنگیہ میں باہر نکلنا اور اس پر ثریا جان کا تبصرہ، میں، وہ اور جہانوی میں بچی کا ماں سے کہنا: ''ممی اب آپ اپنا لنچ باکس کیوں نہیں لے جاتیں، باہر کا کھانا صحت کیلئے ٹھیک نہیں ہوتا''۔ ''ناف کے نیچے'' عالم ارواح میں باپ کا بیٹے کو پشتینی امانت سونپنا، ان سب میں ایک ہلکا سا ابہام ہے جو قاری کو کہانی مکمل ہو جانے کے بعد بھی آگے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مزید برآں ''چانس'' کو وقت کی تشبیہہ بنا دینا، ''داڑھی'' میں عورت کا آخر میں ایک بے ساختہ جملہ: ''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے'' بڑے خوبصورت تخلیقی اشارے ہیں بلکہ ''داڑھی'' میں تو صغیر نے ایک خاص فکر کو بڑی ہنرکاری کے ساتھ پیش کیا ہے کہ دہشت گردی سے خود داڑھی والے (مسلمان) بھی خوفزدہ ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ صغیر رحمانی اپنے افسانوں میں ایک بیدار، ہوش مند، باہنر اور محنتی افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں جو مسائل پر سطحی انداز سے نہیں سوچتا، بیان کرنے کے مراحل میں ''کاتا اور لے دوڑی'' والا انداز نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار صغیر کے لئے افسانہ نگاری ''مشغلہ وقت گزاری'' نہیں ایک سنجیدہ فکری اور اظہاری عمل ہے جس میں ان کا سماجی سروکار، انسانی سروکار اور تخلیقی سروکار، سبھی نے مل جُل کر جلوہ افشانی کی ہے۔

☆☆☆

صغیر رحمانی کے افسانوں میں عصری منظر نامہ

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

صغیر رحمانی کا افسانوی سفر 1987ء میں دہلی کے ایک رسالہ میں شائع ہونے والے اردو افسانہ ''خون بولتا ہے'' سے شروع ہوتا ہے۔ بعد میں صغیر رحمانی ہندی ادب کی طرف بھی مائل ہوئے اور اپنی فنکاری کا نمونہ ہندی میں بھی پیش کرنے لگے جہاں بے شک ان کی خوب پذیرائی ہوئی اور ان پذیرائیوں سے متاثر ہو کر صغیر رحمانی نے ہندی کے افسانوی ادب کو دو افسانوی مجموعے ''پرانے گھر کا چاند'' (2000ء)، اور ''جہاد'' (2011ء) کے ساتھ ساتھ ایک ناول ''اشیس'' (2001) دیے۔ اس طرح دیکھا جائے تو صغیر رحمانی گزشتہ کئی دہائیوں سے ہندی اور اردو ادب کے میدان میں متحرک اور فعال ہیں۔ وہ ادھر کے اپنے چند افسانوں سے ہی لوگوں کی توجہ مبذول کرا لینے میں کامیاب ہیں۔ وہ اپنی بے پناہ تخلیقی قوت اظہار سے اردو افسانوی ادب کے افق پر نہ صرف چھا گئے ہیں بلکہ اپنے وجود کا شدت سے احساس بھی کرا دیا ہے۔

صغیر رحمانی کے افسانوں کے عنوان بھی بڑے معنی خیز ہوتے ہیں جو قاری کو چونکانے کے ساتھ ساتھ فوری طور اس طرح متوجہ کر لیتے ہیں کہ قاری افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ان کے افسانوں کے بیانیہ طرز اظہار کی خوبی اس طرح اپنے ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ دھیرے دھیرے قاری افسانے کے سحر میں کھوتا چلا جاتا ہے اور جب افسانہ ختم ہوتا ہے، تب وہ جہاں ایک جانب افسانہ کے سحر سے نکلتا تو ضرور ہے لیکن دوسری طرف فکر و احساس کی دنیا میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

صغیر رحمانی کا ایک افسانہ ''داڑھی'' ہے جو ماہنامہ ''آجکل'' کے اپریل 2013ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت کا منفرد افسانہ اس لحاظ سے تھا کہ اس میں عصری حالات کی ستم گری، کربنا کی اور ہولنا کی کو پوری طرح ابھارا گیا ہے۔ جس زمانے میں یہ افسانہ شائع ہوا تھا، اس زمانے میں داڑھی، ٹوپی کو بعض سیاسی بازیگروں نے خوف و دہشت کی علامت بنا دیا تھا۔ اس خوف و دہشت کو صغیر رحمانی نے اپنے افسانہ کا موضوع بنا کر ایک خاص مفہوم و معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک گھریلو عورت اپنی سات سالہ بیٹی کو لے کر دہلی سے کانپور تک کا ٹرین سے سفر کرتی ہے۔ اس کی برتھ کے قریب کی دوسری برتھ پر ایک داڑھی والا مسافر بھی اتفاق سے ہم سفر ہوتا ہے۔ داڑھی والے شخص سے ایسی کوئی ایسی حرکت گرچہ نہیں ہوتی ہے کہ اس سے خوفزدہ ہوا جائے لیکن وقت اور حالات نے اس طرح سراسیمہ کر دیا ہے کہ اس شخص کی داڑھی ہی دیکھ کر وہ عورت خوف و دہشت میں ڈوب جاتی ہے۔ اسے طرح طرح کا ڈر ستاتا ہے، پریشان کرتا ہے۔ یہ داڑھی والا کس طرح اس پر حملہ آور ہوگا؟ کس طرح بچی کو زدوکوب کرے گا؟ خوف اور بے چینی کی ان کیفیات کو جس فنکارانہ انداز سے صغیر رحمانی نے ابھارا ہے، وہ یقینی طور پر بہت اثر انگیز ہے، اور ملک کے عصری منظر نامہ کو بھی سامنے لانے میں بھی کامیاب ہے۔

صغیر رحمانی کا ایک دوسرا معرکتہ آلآرا افسانہ ''ناف کے نیچے'' ہے۔ اس افسانہ میں زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام حیات کے اندھے عقائد کی روایت کو دور جدید میں بھی اپنا کر لوگ کس طرح غیر انسانی اور نابرابری کا سلوک کرتے ہیں، اس کا بڑے ہی مؤثر انداز میں اظہار ملتا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے اس افسانہ میں ایک خاص طبقہ، جسے ہم دلت کے نام سے جانتے ہیں، ان پر کس طرح آج کے ترقی پزیر دور میں دھرم کی آڑ میں جبر و ظلم کیا جاتا ہے۔ نفرت اور مظالم کی یہ وراثت جو نسل در نسل ان مظلوموں پر چلی آرہی ہے، اس سے اپنی اگلی نسل یعنی اپنے معصوم بیٹے کو محفوظ رکھنے اور اس سے نجات کے لیے افسانہ کا مرکزی کردار 'وہ' مذہب کے سائے میں پناہ لینا چاہتا ہے لیکن روایات کی پاسداری کرنے والوں کو یہ بھی منظور نہیں کہ وہ روایت سے ذرا بھی روگردانی کرے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کی طرح یہ طبقہ اسی طرح ان کے ہر

ظلم و بربریت کو روایت کا حصہ مانتے ہوئے قبول کرتا رہے، برداشت کرتا رہے۔ مذہب کی تبدیلی کی اس کی خواہش کی خبر ملتے ہی مذہب کے ٹھیکہ دار اور سیاست داں اپنی گندی سیاست کی روٹی سینکنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پورا منظر نامہ عصری حالات کے جبر و ظلم پر محیط ہے، جسے بڑی خوبصورتی اور فنکارانہ حسن کے ساتھ صغیر رحمانی نے بیان کیا ہے۔ دلتوں پر ہونے والے ظلم و تشدد پر یوں تو بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں لیکن عصری منظر نامہ میں اس افسانہ کی نوعیت بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ اس افسانہ میں درد و کرب کی جو ٹیس ابھرتی ہے، انھیں قاری فراموش نہیں کر سکتا ہے۔

اس افسانوی مجموعہ کا ایک اور افسانہ ''پہلا گناہ'' بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ یہ افسانہ طوائف کی زندگی پر محیط ہے، جس کی قرأت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ طوائفوں کی زندگی پر یوں تو بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں، لیکن یہ افسانہ کئی لحاظ سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی عورت طوائف خوشی سے نہیں بنتی اور جب طوائف بنتی ہے تو وہ اپنے تمام تر ماضی کو فراموش کر حال کی پناہ گاہ میں اس طرح سمانے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کا مستقبل بھی چکا چوندھ رہے۔ طوائف کی زندگی، اس کی روایت، خاص طور پر نئی لڑکی کی نتھ اترائی کی رسم کا جس طرح سماں صغیر رحمانی نے پیش کیا ہے، وہ بہت دلچسپ اور معنی خیز بھی ہے کہ ایک طوائف ماں اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیٹیوں کے شاندار مستقبل کے لیے کتنے جتن کرتی ہے۔ اس افسانہ میں ماں ناظرہ بی کی خوبصورت بیٹی ثریا جان کی نتھ اترائی کی رسم و رواج کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ نہ صرف چونکاتا ہے، بلکہ لمحۂ فکریہ بھی عطا کرتا ہے۔ اس افسانہ کا آخری حصہ تو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ ثریا جان جس نطفہ سے عالم وجود میں آئی تھی، وہ اس کے تقاضوں کو کس طرح پورا کرتی ہے۔ اس نوخیز لڑکی ثریا جان میں انقلابی مزاج و عادات و اطوار کا انوکھا پن تھا اور وہ دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی اور اس کی اسی مختلف مزاجی اور فطرت نے اس کی نتھ اترائی کے موقع پر ایسا سفاک اور ہولناک منظر دکھایا کہ اس کی ماں ناظرہ بی بھی ہکا بکا رہ جاتی ہے، اس لیے کہ اسے ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ لڑکی ایسا بھی کر سکتی ہے۔ نتھ اترائی کے روایتی موقع پر جو حادثہ رونما ہوا، اس نے طوائف کی زندگی میں قدم

رکھنے والی اس نئی نویلی لڑکی نے پوری انسانیت کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ یہ افسانہ بھی فکر و احساس کے ساتھ ساتھ ان فنّی بلندیوں پر لے جاتا ہے جو افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ کی حیثیت سے شامل ہونے کا متحمل ہوتا ہے۔ صغیر رحمانی نے چونکہ ہندی ادب اور خاص طور پر ہندی کہانیوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس لیے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ آج کا وہی ادب قابل توجہ ہے، جو عصری حالات اور عصری مسائل پر مبنی ہوں۔ اس لیے ان کے افسانوں کے موضوعات پوری طرح وہی ہوتے ہیں، جو عصری منظر نامہ کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''لیکن یہ.....'' بھی ایسا ہی افسانہ ہے، جس میں عصری منظر نامہ کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس افسانہ میں بھی صغیر رحمانی نے بڑی چابک دستی سے کریم بخش اور ان کے بیٹے محمد اسلام کے کردار کو آفاقیت بخشی ہے جو مختلف واقعات، حادثات اور سانحات سے گزرتے ہوئے ایسا منظر نامہ پیش کیا ہے، جنھیں ہم آئے دن اپنے اردگرد رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اپنے اس افسانہ میں فنکار نے سیاسی دہشت گردی اور سماجی شدت پسندی کو انسانی حقیقت پسندی کے آئینہ میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ افسانہ مقامی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کی دہشت گردی کو بڑے ہی مؤثر انداز میں نشان زد کرتے ہوئے بعض حقائق پر سے پردہ بھی اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

صغیر رحمانی کے یہ تمام افسانے ایسے ہیں، جو اپنے حسن و معیار اور اپنے اسلوب فن کی انفرادیت کی شان رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کے افسانے ابتدا سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور قاری جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے، اس کی دلچسپی اور انہماک میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آخر میں یہ افسانے اس طرح چونکاتے ہیں کہ ان کے اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ صغیر رحمانی کے اس افسانوی مجموعہ کی بازگشت بہت دور تک اور بہت دیر تک سنی جائے گی۔

☆☆☆

صغیر رحمانی کی 'داڑھی' اور دوسری کہانیاں

غالب نشتر

افسانے کی تنقید کے حوالے سے موضوع اور ہیئت کا مسئلہ ہمیشہ سے ہی بحث کا موضوع رہا ہے۔کوئی مواد کو اہمیت دیتا ہے تو کسی کے نزدیک ہیئت ہی افسانے کی آبرو و جان ہے۔افسانے کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ افسانوی تنقید کی ترجیحات بھی زمانے کے ساتھ بدلتی رہی ہیں،کبھی مواد کو زیادہ اہمیت دی گئی تو کبھی ہیئت نے اپنا لوہا منوایا۔نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا فنی محاسبہ کیا جائے ہیئت سے زیادہ مواد یا موضوعات کا تنوع دکھائی دیتا ہے۔یوں بھی اچھا افسانہ اساسی موضوع کے ساتھ ضمنی موضوعات اور ظاہری موضوع،زیرسطحی موضوعات کو بھی دامن میں لیے ہوتا ہے لیکن نئی صدی کے مسائل و مشکلات کے دور میں افسانوی تقلیب میں مواد سے زیادہ ہیئت پر توجہ صرف کی جائے تو کوئی واقعہ/سانحہ بننے کے ساتھ قارئین/ناقدین کے ذہنوں میں کرید پیدا کرنے یا یادداشت کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔نئے افسانے میں موضوعاتی تنوع کی بات کریں تو صغیر رحمانی کا نام نمایاں طور پر ہمارے ذہنوں میں گردش کرنے لگتا ہے۔انھوں نے ایک زمانے سے افسانوی دنیا میں اعتبار قائم کیا ہے۔'واپسی سے پہلے' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 2002ء میں اشاعت سے ہمکنار ہو کر مقبول خاص و عام ہوا۔مجموعے میں شامل اٹھارہ افسانوں میں کئی افسانوں نے باذوق قائین کے ذہنوں کو اپنی جانب کشید کیا تھا۔زیرنظر مجموعہ 'داڑھی' میں بھی کئی افسانے قاری کو اپنی جانب توجہ کشید کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر پہلی ہی کہانی کو لیں جو مجموعے کی ٹائٹل کہانی بھی ہے جہاں ''داڑھی'' ایک ایسی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے جو بےوفائی،دہشت گردی اور منافقت،تشدد،ڈر اور خوف کی ملی جلی عبارت ہے۔جو شخص داڑھی رکھ کر یا باشرع لباس میں

سفر کرتا ہے تو دوسرے مسافر اُسے دز دیدہ نظروں سے دیکھ کر گھائل کر دیتے ہیں، بات چیت تک کرنا گوارہ نہیں کرتے اور لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں داڑھی والا خود کو مجرم تصور کرنے لگتا ہے جیسا کہ مذکورہ افسانے کا بیانیہ ہے۔ کہانی ایک عورت اور آٹو ڈرائیور کے باہمی کلام سے آگے بڑھتی ہے۔ عورت، عوام کی نمائندہ ہے۔ وہ جب اسٹیشن پہنچتی ہے تو ہر سُو لوگوں کے دلوں میں خوف اور وحشت طاری ہے۔ معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ کسی دوسرے شہر میں دہشت گردانہ حملہ ہوا ہے جس نے پورے ملک کو اپنے حصار میں لے لیا ہے اور اسی لیے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر تحفظ کے انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔ عورت چوں کہ عوام کی نمائندہ ہے اسی لیے وہ بھی خوف زدہ ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک طاری رہتی ہے جب تک وہ سفر ختم نہیں کر لیتی۔ جس مشکوک شخص کی وجہ سے عورت کے دل میں وسوسے گھر کر لیتے ہیں، وہ فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے گویا وہ بھی حالات سے خائف ہے۔ ایسے وقت میں کہانی نیا موڑ اُس وقت لیتی ہے جب عورت ٹرین سے اترتے ہی اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ اس طرح سے یہ کہانی اُن باطل رویوں کا بھی انکار کرتی ہے جو یہ سمجھنے کی بھول کر بیٹھے ہیں کہ دہشت گرد فقط مسلمان ہی ہوتے ہیں کیوں کہ اس کہانی میں خوف زدہ ہونے والا بھی مسلمان ہے اور جس کے ذریعے خوف پیدا ہو رہا ہے وہ بھی اسی قبیلے کا ایک فرد ہے۔ اس طرح سے دیکھیں تو داڑھی والا شخص تذبذب کے عالم میں سفر کرنے پر آمادہ ہے، سفر جو زندگی کے رزم و بزم کا استعارہ ہے، سفر جس سے مفر نہیں بلکہ یہ مسلسل جدو جہد کی علامت ہے۔ کہانی میں سفر کرنے والا شک و شبہے کے حصار میں ہے، دوسری جانب مذہبیت کا پٹا اُس کے گلے میں بندھا ہوا ہے۔ اس کہانی میں دو واضح پہلو شانہ بہ شانہ چلتے ہیں اوّل تو یہ کہ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اُس کے واحد ذمے دار ''داڑھی والے'' ہیں جنھوں نے زمین پر فساد پھیلایا ہوا ہے (جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے) اور ثانیاً یہ کہ اس شک کو مزید ہوا دینے میں برقی میڈیا نے کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔

دہشت کردی کی ایک قسم تو وہ ہوتی ہے جس کا ذکر ''داڑھی'' میں ہے لیکن دوسری صورت اور بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور وہ اس وقت نظر آتی ہے جب کسی شریف الطبع نوجوان کو بنا کسی جرم کے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ جیسا کہ افسانہ ''لیکن یہ.....'' میں ہے جہاں کریم بخش، محلے کے شریف ترین بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں، مسلم، ہندو، سکھ عیسائی سب اُن کی عزت کرتے ہیں، بھروسا کرتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن جب کریم بخش کے بیٹے کی بات آتی ہے تو عملۂ پولیس بلاتردد کہہ دیتی ہے کہ ''اسلام دہشت گرد کے ہاتھوں لگ گیا ہے۔'' یہاں یہ بات قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ مولوی کریم بخش کے بیٹے کا نام بھی اسلام ہے۔ جب وہ اپنے بیٹے کی لاش کی شناخت کرنے جاتے ہیں تو اُن کا یہی جملہ ہوتا ہے کہ ''ہاں...میں اسے پہچانتا ہوں....یہ میرا بیٹا تھا لیکن....یہ اسلام نہیں ہے.....'' دونوں افسانوں کا منظر نامہ یوں تو ہندوستان کا ہی ہے لیکن ان مسائل سے پوری دنیا نبرد آزما ہے، جہاں ایک خاص طبقے کو ہر طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے اور کوئی بھی حادثہ رونما ہو تو اُس کی ذمے داری بھی وہی ایک خاص گروپ قبول کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ باتیں مکمل طور پر صحیح نہیں ہو سکتیں، ان کے پس پشت کئی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔ صغیر رحمانی نے اپنے افسانوں میں ان بین الاقوامی مسائل کو جگہ دے کر نئے موضوعات کی جانب ایک جست لگائی ہے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات میں جنسی پیچیدگیاں، نفسیاتی کشمکش، مسلم تہذیب، اسلامی روایات اور اقلیتی مسائل خاص طور پر اہم ہیں۔ وہ افسانوں میں موضوعات کے ساتھ بھرپور مواد کو یکجا کر کے خامیوں کی جاب بھی اشارے کرنا نہیں بھولتے ہیں۔ افسانہ ''جہاد'' ایک ایسے ہی ضعیف الاعتقاد نوجوان کی کہانی ہے جس کے اندر اسلامی تعلیمات کی بُو باس ذرہ برابر بھی نہیں ہے ساتھ ہی وہ اسلام کے فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہے لیکن ظاہر سی بات ہے، اس سے مذہب کو نقصان ہی پہنچے گا۔ اسی طرح ''سیڑھیاں'' ریز رویشن کی کہانی ہے۔ چودھری شجاعت حسین، جو کسی زمانے میں زمیندار ہوا کرتے تھے لیکن وقت اور شب و روز کی گردش نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُن کا نام فقط نام تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ حد تو یہ

ہے کہ چودھری صاحب کا صاحبزادہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا محض اس وجہ سے کہ اُس کا شمار کسی خاص طبقے سے نہیں ہے۔ ریزرویشن کی بات آئی ہے تو سر دست افسانہ ''ناف کے نیچے'' کا ذکر اس ضمن میں نہایت ضروری ہے۔ صغیر رحمانی واحد ایسے فن کار ہیں جنھوں نے دلت طبقے کو''ناف کے نیچے'' سے تعبیر کیا ہے۔ یوں تو دلت موضوع و مسائل کے حوالے سے نئی صدی میں کئی اہم کہانیاں خلق کی گئی ہیں اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے لیکن اس جم غفیر میں صغیر رحمانی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے موضوعاتی سطح پر قارئین کو حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ذہنی مشاقی کا ثبوت ہی ہے کہ ان کے تازہ ناول ''تخم خوں'' میں بھی دلت موضوع کو بنیادی حوالہ بنایا گیا ہے۔ وہ کرداروں میں ڈوب کر کہانیاں رقم کرتے ہیں۔ کہانی ''ناف کے نیچے'' میں ہندو دیو مالا سے استفادہ کرتے ہوئے ازل سے ابد تک دلت طبقے کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کی تاریخ کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے اور یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اشرف المخلوقات نے جتنی بھی ترقی کی منازل طے کر لی ہوں لیکن وہ ذہنی طور پر وہ لکیر کے فقیر ہی ہیں جو بہ ظاہر بنی نوع انسان پر براہ راست طنز ہے۔

صغیر رحمانی کے تازہ مجموعے ''ڈاڑھی'' میں شامل دس افسانے الگ ذائقے کے ہیں اور اُن میں زندہ رہنے کی صلاحیت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے موضوعات وتکنیک کی انفرادیت کا ہی نتیجہ ہے کہ قاری کو صغیر رحمانی کے افسانوں کا انتظار رہتا ہے۔ قوی امید ہے کہ یہ مجموعہ قارئین کی دلچسپی کا سبب بنے گا۔

☆☆☆